
میٹھا سچ
فرحین چوہدری

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

میٹھا سچ

میٹھا سچ

فرحین چوہدری

سخن پبلی کیشنز

لاہور

ہمارا مقصد

کتاب دوستی

تزئین و اہتمام:

وقاص عزیز

نام کتاب:	میٹھا سچ
مصنفہ:	فرحین چوہدری
ٹائٹل:	عمران شناور
طبع اوّل:	فروری2018ء
کمپوزنگ:	زربفت پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
قیمت:	600روپے
بیرون ملک:	10پونڈ......15ڈالر (امریکن)

انتساب

ان کے نام جن کی میں تخلیق ہوں

ان کے نام جو میری تخلیق ہیں

اور

ان کے نام

جنہیں تخلیق کے بعد

نالیوں اور کوڑے دانوں میں پھینکا گیا

فہرست

☆☆☆

میٹھا سچ

دوستو......!!!

زندگی بذات خود ایک کہانی ہے ......اور کہانی کار جانے انجانے میں اپنی کہانیوں کا کردار......کبھی لاشعوری تو کبھی شعوری سطح پر......میری کہانیاں میری انگلی تھامے چلتی ہیں ......مرے افسانے ، میرا قلم تھامے میرے کاغذوں پر آن کر بیٹھ جاتے ہیں ......مرے الفاظ تو بس ان کے وجود کا احاطہ کرتے ہیں ...... یوں کردار سوچوں اور حالات و واقعات کی رو میں بہتے ، ڈوبتے ابھرتے خود کو منواتے چلے جاتے ہیں......اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے......

سچے جھوٹ، آدھا سچ اور اب میٹھا سچ ؟ آخر سچ کی تکرار کیوں؟

شاید مجھے سچ کی شدت سے تلاش ہے......اپنے اندر، اپنے باہر......

یا پھر اندر باہر کا سچ پکتا ہے ابلتا ہے اور کسی بھی لمحے تخلیقی لاوہ بن کر بہہ نکلتا ہے......کسی کہانی کسی نظم کسی کالم یا ڈرامے کے روپ میں......

میری ہر کہانی مرے اشعار ہی کی مانند مجھ پر آمد کی صورت نازل ہوتی ہے......

بس ایک جملہ چھنا کے سے ذہن کے صحن میں اترتا ہے......پھر کہانی آگے آگے اور میں قلم لیے اس کے پیچھے پیچھے...... یہاں تک کہ کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے......

لیکن کیا واقعی یہی اختتام اصل ''اختتام'' ہوتا ہے؟

بس اسی ''سچ'' کی مجھے تلاش ہے......!!!

فرحین چودھری

☆☆☆

گیلے پر

اُس نے سردی سے بچنے کے لئے کوٹ کے کالر اُونچے کر لئے۔ مفلر مزید کَس کر گلے کے گرد لپیٹا، جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر سکڑا سکڑا سا چلتا ہوا بڑی سڑک پر آ گیا۔

اِکا دُکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ مُندی مُندی روشنی میں ٹھیلوں والے کہیں کہیں کھڑے تھے۔ اُن کے ٹھیلوں پر سجے چلغوزوں، مونگ پھلیوں اور خشک خوبانیوں کا ذائقہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہونے لگا۔ ساتھ ہی فوراً چھوٹی سی مٹی کی ہانڈی سے اُٹھتا دُھواں، اُسے اپنی آنکھوں اور حلق میں گھستا محسوس ہوا۔ وہ دونوں کیفیات کو خود سے پرے دھکیلنے کا جتن کرتا ہوا تیزی سے چلنے لگا۔

گھنٹے بھر کا راستہ ابھی باقی تھا۔ سُستی سے چلتا رہتا تو ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا اور دروازہ کھلوانے کی کوفت الگ ہوتی۔ ویسے بھی تیز چلنے سے سردی کا احساس کم ہونے لگتا ہے۔

وہ روز اِسی وقت، اِسی راستے سے اِنہی مناظر کے پس منظر کے ساتھ حرکت کرتا ہوا لمحہ بہ لمحہ ماضی میں قید ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے گرد ایسا ہی سیاہ سناٹا چھایا رہتا تھا، اندر بھی اور باہر بھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے اس راستے کو وہ دن بھر کے واقعات کی کھچڑی پکانے، انواع و اقسام کے لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیوں کا چسکا لینے اور اپنی ہلکی

سی بڑبڑاہٹ کے لئے استعمال کرتا تھا کہ یہی لمحات تھے جو خالصتاً اس کے اپنے تھے۔ وہ آزادی کے ساتھ ہنس سکتا تھا، رو سکتا تھا۔ افسرانِ بالا، بیوی، مالکِ مکان حتیٰ کہ حکومت کو بھی بہ آوازِ بلند حسبِ ضرورت ننگی ننگی گالیوں اور مغلظات سے نواز سکتا تھا۔ یہ ۹۰ منٹ وہ روشن دریچہ تھے جو no man's land میں کھلتے تھے۔ اس کے اندر کی بہت ساری گھٹن، بھڑاس اور زہر اس دریچے کے ذریعے کسی گھر کی فضا کو متعفن کئے بغیر ہوا میں تحلیل ہو جایا کرتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ یہ ۹۰ منٹ پردہ سیمیں کا روپ دھار لیتے اور وہ اپنا بچپن، لڑکپن، بچھڑے خواب، سہانے گیت سب کچھ اس پر دیکھ لیتا۔ کئی بار وہ اچانک کسی کھلے مین ہول میں گرتے گرتے بچا۔ بارہا آوارہ کتوں نے اسے کئی فرلانگ تک گلیوں میں ریس بھی لگوائی۔ ڈیوٹی پر موجود اصلی اور نقلی چوکیداروں نے سیٹی بجا کر اُسے روکا بھی۔ ریڑھی والوں نے مشکوک نظروں سے گھورا۔

لیکن کئی سال سے رات کے اندھیرے میں اُبھر کر رات ہی کے اندھیرے میں تحلیل ہو جانے والا سایہ، آہستہ آہستہ اسی ماحول کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ بھی اب بتا سکتا تھا کہ کتنے قدم کے بعد کون سا مین ہول آئے گا؟ کس موڑ پر کون سا ریڑھی والا ہے؟ کس گلی میں کتنے اور کس مزاج کے کتے ملیں گے یا کون سا چوکیدار کس Tone میں سیٹی بجاتا ہے؟ کس گلی کے کس گھر میں رات کے کس پہر کون آتا ہے؟

پانچ ہزار چار سو سیکنڈ کے بعد وہ جس دروازے پر اپنی مخصوص دستک دیتا تھا، وہ دروازہ ٹھیک دو منٹ کے بعد کھلتا۔ نیند میں بوجھل آنکھیں، گلے شکوے اور غصہ سمیٹے اسے کچھ دیر ٹٹولتی رہتیں، پھر زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ وہ چہرہ دروازہ بند کر کے اگلے کمرے کا در کھول دیتا۔ جہاں ایک چھوٹی سے دنیا اس کی منتظر ہوتی۔

دن بھر فائلوں کے ساتھ گتھم گتھا رہ رہ کر وہ اب ہر بات فائل اور کیس کے حوالے سے کرتا۔ اس کے ادبی شوق مشہور ہونے کے خواب کاغذ پر لکھ لکھ کر نظمیں اور کہانیاں چھپا چھپا کر رکھنا۔ سب کچھ کسی Pending file کے زُمرے میں آ گئے تھے۔

یہ فائل ابھی تک بند اس لئے نہ ہوئی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے دوران کبھی کبھی اس فائل کے چند صفحوں سے بھی وہ گرد جھاڑنے لگتا۔

جب وہ نیا نیا اِس آفس میں آیا تھا تو اُس کے جوتے چمکتے تھے۔ استری شدہ کپڑوں اور گھنے جمے ہوئے بالوں کے ساتھ جب وہ دفتر میں داخل ہوتا تو گھاگ کلرک موٹی موٹی عینکوں کے پیچھے سے ابرو چڑھا کر ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے۔

کئی سال تک فائلوں کے گرد و غبار سے نبرد آزما رہنے کے بعد اس کے بالوں پر بھی پھپھوندی لگ گئی تھی۔ کپڑے بھی ملگجے ہو گئے تھے اور گرد آلود جوتوں کے تلے بھی گھس گئے تھے۔

بیمار ماں باپ کو مٹی کے ڈھیر تلے نجات دلا کر وہ پرسکون تھا۔ بہنوں کی شادیوں کے بعد اس کے کاندھے اور بھی ہلکے پھلکے ہو گئے تھے کہ دو کمروں کا کواٹر بھی بک چکا تھا۔ وہ اپنا دامن جھاڑ کر صابر و شاکر قسم کی بیوی اور دو عدد بچوں سمیت اس کمرے میں اُٹھ آیا تھا کہ یہ کمرہ عین بازار میں، زندگی کے شور شرابے سے پُر تھا۔ اس کمرے کی دیواریں، چھت کا رنگ و روغن زندگی ہی کی طرح بے رنگ اور ناپائیدار تھا۔ یہ مماثلت اسے نجانے کیوں اچھی لگی۔ کرایہ بھی جیب کے حساب سے ٹھیک تھا۔ بیوی کے گھٹے گھٹے احتجاج کے باوجود اس نے کمرہ لے لیا۔

وہ تو خوف کی کیفیت سے باہر آ گیا تھا، لیکن بیوی مزید خوف کے سائے تلے۔۔۔!

پہلے پہل وہ سماجی مسائل پر سیاسی حالات پر، سیکنڈلز پر، بڑے جوش و خروش سے بولا کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ حالات بدل جائیں گے اور انقلاب بپا ہو گا۔ لوگوں کے غم دُور ہو جائیں گے اور دُنیا خوشحال ہو سکے گی۔

لیکن گزرتے وقت کے ہر لمحے نے جاتے جاتے دھیرے سے اُسے یہ سمجھا دیا تھا کہ کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔۔۔ زندگی یہی ہے۔

صرف خوشی اور امن و سکون تو تین گھنٹے کی فلم میں بھی نہیں ہوتا، جب تک ٹریجڈی سین نہ ہو، ہاتھا پائی نہ ہو، ایک آدھ گولی نہ چلے تماش بینوں کو فلم کا مزہ نہیں آتا۔

یہ تو پوری کائنات کا نظام ہے۔ کیسے ایک ہی موڈ کے تابع ہو جائے؟ یہ بات اس کی عقل میں آ تو گئی تھی مگر ذرا دیر سے۔

اب وہ شانت تھا۔

پکوڑے والے سے پکوڑے خریدتا تو اخبار کے چکنے کاغذ پر سیاست دانوں کی ٹیڑھی میڑھی بگڑی شکلیں اور جھوٹے سچے بیانات کو مزید توڑ مروڑ کر زمین پر پھینک دیتا۔ اسے اب ہنسی آتی تھی یہ سوچ کر کہ وہ اپنے پسندیدہ لیڈر کی تصویر والے اخبار کو کس طرح سیدھا کر کے احتیاط و عقیدت کے ساتھ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا کرتا تھا۔ اب تو اس کے نزدیک یہ سماجی اور سیاسی لیڈر اداکاروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

''سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔۔۔ مداری۔۔۔ ڈگڈگی بجاتے

ہیں۔۔۔مجمع لگاتے ہیں۔۔۔جیبیں بھرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔۔۔''

اُس کے نزدیک تمام فلسفے، تمام اِزم (ism) عوام کو بے وقوف بنانے کے حیلے تھے اور کچھ نہیں۔

''بھوکے پیٹ، ننگے تن، بے چھت سر کا مسئلہ، انسانی زندگی اور اس کی ضروریات ہیں۔۔۔''

وہ کھرے کھرے الفاظ میں اپنی رائے دے کر ایک طرف ہو جاتا۔۔۔

چٹ پٹے بیانات اور سکینڈلز کے سہارے ذہنی عیاشی کرنے والے اُسے خشک اور بور کہنے لگے تھے کہ اُس کا لہو اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی اور اس کے خیالات کی حیثیت۔۔۔سگریٹ کے چھوڑے ہوئے دھوئیں سے زیادہ نہیں۔

آج وہ بڑے موڈ میں تھا۔ یونہی بلا وجہ۔۔۔ایک پرانی دھن گنگناتے ہوئے اسے یاد آیا کہ لڑکپن میں جب وہ خود کو بڑا انقلابی بنانے کے چکر میں تھا تو ایک مرتبہ باپ نے ماں سے کہا تھا

''اسے سنبھالو بہت پَر نکل آئے ہیں اس کے۔۔۔''

''پَر تو نکلیں گے۔۔۔گھونسلوں میں تھوڑا ہی بیٹھے رہیں گے بچے۔۔۔تم باپ ہو۔۔۔ان کے پروں کو زیادہ خشک نہ ہونے دینا۔۔۔محبت کے چھینٹے دیتے رہو گے تو اُڑان زیادہ اونچی نہ ہو گی۔ نیچی اڑان والوں کو شکروں اور گِدھوں کا ڈر کم ہوتا ہے۔''

وہ تو کچھ سمجھا۔۔۔کچھ نہ سمجھا مگر باپ نے ماں کو نثار ہو جانے والی نظروں سے ضرور دیکھا تھا کہ وہ اپنی عقل مند بیوی کے سامنے ہمیشہ لاجواب ہو جایا کرتا تھا اور

اِس بات پر فخر بھی کرتا تھا۔

بادِ سموم کے جھونکوں میں۔۔۔چٹیل ریگزاروں پر اُڑان کے دوران اُسے ماں کی بات کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ شاید اسی لئے وہ اس زندگی سے مطمئن بھی تھا اب۔۔۔اسے شکروں اور گِدھوں کا خوف نہ تھا۔

وہ ماں کی بات یاد کر کے مسکرا دیا۔۔۔سردی کی ایک شدید لہر آئی تو بے اختیار اس کے منہ سے ''سی'' نکل گئی۔ اس نے اپنے کوٹ کو مزید سمیٹنے کی کوشش کی۔۔۔ہاتھوں کو رگڑ کر جیبوں میں ٹھونسا، ٹھوڑی کو سینے سے لگا کر قدم تیز کر دیئے۔۔۔یکا یک دور کہیں فائرنگ کی آواز گونجی۔۔۔ہلکی سی چیخ و پکار کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔۔۔موت کا۔۔۔گناہ کا۔۔۔!!

وہ چونکا تو ضرور مگر یہ کوئی اتنی انہونی بھی نہ تھی۔ اس نے اور تو کیا کرنا تھا بس اس کی رفتار اب بھاگنے کے مشابہہ ہو گئی تھی۔

دروازے کی اوٹ میں چھپی آنکھوں میں خوف اور بے تابی تھی، شاید فائرنگ کی آواز وہاں تک پہنچ گئی تھی۔

''جلدی آ جایا کرو۔۔۔''

''کوشش تو کرتا ہوں۔۔۔مگر زندگی کا پہیہ بہت تیز چلتا ہے۔۔۔ساتھ ساتھ بھاگنا تو پڑتا ہے نا۔۔۔''

اس نے ہنس کر خوفزدہ آنکھوں میں مسکراہٹ بکھیرنا چاہی۔۔۔مگر وہاں بدستور کالی چادر تنی تھی۔۔۔ڈر بُکل مارے بیٹھا تھا۔

''اچھا۔۔۔کل سے جلدی آؤں گا۔۔۔تم کھانا نکالو۔۔۔''

اُس نے نرم و نازک شانہ تھپتھپایا۔

اگلی رات۔۔۔وہ اپنے مخصوص وقت سے کوئی دو گھنٹے پہلے اُٹھ گیا،لیکن سڑکوں پر سردی کے مارے اسی طرح ہُو کا عالم تھا۔گلیوں میں وہی آسیب زدگی۔۔۔وہی ٹمٹماتے بلب۔۔۔وہی اونگھتے خوانچوں والے اور وہی بھونکتے کتے۔۔۔

اسے افسوس ہونے لگا اپنی جلد بازی اور جذباتیت پر۔۔۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بیوی کے وہم کی وجہ سے۔۔۔روزی پر لات مارنا شروع کر دوں۔۔۔خوف کہاں اور کب نہیں موجود۔۔۔پچھتاوا اس کے پیروں سے جیسے سانپ بن کر لپٹنے لگا۔یکا یک اسے محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی آ رہا ہے۔۔۔اس نے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔۔۔چند قدم چل کر اسے پھر لگا کہ کوئی نہ کوئی تو ہے۔۔۔دبے دبے تیز قدم اُسے سنائی دے رہے تھے صاف۔اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے برف سی بھر گئی۔۔۔اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔۔۔اگلی گلی میں مڑتے ہی ایک ہلکی سی کلک سنائی دی اور پہلو میں آگ کا انگارہ سا گھستا محسوس ہوا۔۔۔اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اور شعلہ سا لپکا۔۔۔ہاتھ گیلا گیلا سا ہو گیا۔ سینے پر ہاتھ رکھا تو۔۔۔بس ہاتھ گیلا ہونے کے احساس سے لے کر زمین پر گرنے تک کے وقفے میں۔۔۔اس کا بچپن جوانی دروازے کی اوٹ سے جھانکتی خوفزدہ آنکھیں، بچے، ماں، باپ سب کچھ جیسے Fast Forward ہو گیا۔

آخری سانس کے ساتھ اس نے سوچا۔۔۔ماں اتنی عقلمند بھی نہیں تھی۔۔۔وہ شاید غلط کہتی تھی۔۔۔اسے بتاؤں گا کہ

''بھوکے شکرے تو نیچی اڑان والے پرندوں پر بھی جھپٹ پڑتے ہیں''

☆☆☆

دیمک

''آں۔۔اوں۔۔آں'' اس نے منہ پھاڑ کر جماہی لیتے ہوئے حلق سے عجیب سی غیر انسانی آواز برآمد کی، جسے سن کر چند قدم دُور لیٹے ہوئے ڈبو نے تھوتھنی اُٹھا کر ناگواری سے ہلکا سا ''بھوؤں'' کیا اور پھر پنجوں پر سر رکھ کر اونگھنے لگا۔زینو نے جھلنگا چارپائی کی ادوائن میں پھنسی اپنی ٹانگوں کو جھنجھلا کو کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے کتے کی اس حرکت پر اس کا ناجائز رشتہ اس کی ماں بہن سے جوڑ کر (جو کہ کتوں میں جائز ہی ہوتا ہے) زمین پر تھوک دیا۔

گندے بڑھے ہوئے ناخنوں والے سانولے گدرائے پیروں میں ٹوٹی چپل گھسیٹتے ہوئے اس نے زمین و آسمان کے درمیان موجود تمام مخلوقات کو مغلظات کی ایک لمبی فہرست سے نوازا۔جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی رضائی کو ڈھیر بنا کر چارپائی پر رکھا اور ٹیڑھا ٹیڑھا چلتی ہوئی ڈبو کے پاس آئی کہ اس کا ایک پاؤں پچھلے کئی مہینوں سے رِستے زخم کے باعث درد کر رہا تھا۔جانے کوئی کانٹا تھا یا کانچ، نہ زینو نے پروا کی نہ اوپر والے نے، کبھی دوا ملی تو لگا لی، ورنہ نہ پانی بہا کر زخم کا منہ صاف کر دیا سو وہ زخم بھی کئی دوسرے زخموں سمیت اب اس کے وجود کا حصہ بن چکا تھا اب۔۔۔

ڈبو نے زینو کے خطرناک تیور دیکھ کر سر اُٹھائے بغیر ہی اُسے سونگھنے کی کوشش کی

مگر زینو کی ایک زوردار لات نے اسے وہاں سے ''چیاؤں چیاؤں'' کرتے ہوئے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ زیادہ دُور جانا ڈبو کے اُصول کے خلاف تھا سو وہ تھوڑی دُور جا کر پھر تھوتھنی پنجوں پر جما کر بیٹھ گیا۔ ہلکی سی ناراض سی ''بھوؤں بھوؤں'' کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

زینو بکتی جھکتی اپنا لحاف اُٹھائے جھونپڑی میں گھس گئی۔ جھونپڑی کیا تھی۔ ٹین کی دو زنگ خوردہ مٹیالی سی چادریں، جن کے وجود پر سینکڑوں آنکھیں اُگ آئی تھیں۔ اینٹوں کی اک ملبہ نما دیوار کا سہارا لیے تھکی ہاری جھکی کھڑی تھیں کہ ان پر پھٹی پرانی کئی ترپالوں، بوریوں اا ور گھاس پھونس کا ناکارہ سا بوجھ لدا ہوا تھا۔

شہر سے چند کلومیٹر باہر ٹرک ہوٹلوں، پنکچر کی دکانوں اور ورکشاپوں کے قریب بنی یہ جھونپڑی زینو کو اس لئے پسند آ گئی کہ یہاں اس کے ماضی سے کوئی واقف نہ تھا ویسے تو جھونپڑی کب کیوں کس نے بنائی تھی۔ مکان و مکیں دونوں بے نام و نشان تھے سو زینو اور جھونپڑی کی نبھنے لگی۔

زینو کے آنے سے قبل سڑک بنانے والے مزدور، چائے اور کھانے کے کھوکھوں اور ورکشاپوں پر کام کرنے لڑکے وقتاً فوقتاً جھونپڑی کو استعمال کرتے بوڑھے کے کُب میں اضافہ یا کمی کرتے اور چلے جاتے۔

اب تک شاید دنیا کی یہ واحد NO MAN'S LAND تھی جو فی الحال شراکت اور ملکیت کے جھگڑے سے پاک تھی لیکن جب سے زینو نے اس پر قبضہ کیا تھا قرب و جوار کے مزدوروں کو یقین ہو چلا تھا کہ اب یہ جھونپڑی ان کے ہاتھ سے گئی۔

پہلے پہل تو کچھ جی داروں نے اس غاصبانہ عمل کی مذمت زبانی اور عملی طور پر کرنا

چاہی کہ یہ ان کے ازلی حقِ ملکیت برائے زن و زمین پر براہِ راست حملہ تھا لیکن زینو اور ڈبّو کے سامنے زیادہ دیر ٹِکنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا۔ کیوں کہ دونوں کے بھونکنے کا عمل خاصا متواتر اور مہلک تھا۔ سو جیالوں کی بھیڑ چھٹتی گئی اور زینو کو بے دخل کرنے کا جوش و خروش، ندامت اور پھر کھسیانی ہنسی مذاق میں بدلنے لگے۔

اب زینو اور ڈبّو اس علاقے کا حصہ بن چکے تھے۔ ویسا ہی بد رنگ، بد ہیئت اور اُجڑا اپجڑا۔

زینو سویرے سویرے اُٹھ کر کھوکھے والے فیقے کے پاس آ کر زمین پر ڈبّو سمیت بیٹھ جاتی۔ چائے کا ایک مگ اور دو کلچے اس کی حاجت ہوتے۔ ایک کلچہ وہ ڈبو کو کھلا دیتی اور دوسرا خود چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتی۔ فیقا رات کی بچی کھچی ہڈیاں بھی از راہِ کرم ڈبّو کر ڈال دیتا۔

زینو سے فیقے نے کھانے پینے کی قیمت کبھی نہ مانگی تھی۔ ایک تو گالیوں کا ڈر، دوسرے ویسے بھی فیقے کے اپنے حساب سے قیمت وصول ہو ہی جاتی تھی۔

شہر سے دور خالصتاً مردانہ ماحول میں میلی کچیلی زینو کا وجود غنیمت تھا۔ نیم برہنہ لباس سے جھانکتے گول شانے، سڈول سانولی پنڈلیاں لمبے اُلجھے بال اور اتھل پتھل ہوتا بدن۔ فیقے کے جسم کے کسی گوشے میں لذّت آمیز سنسناہٹ اور پھر ذاتی تفریح کا باعث بن جاتا۔ ویسے بھی زینو کی موجودگی میں مزدوروں کی آمد اور فیقے کی بِکری میں اچانک ہی اضافہ ہو جاتا سو فیقے کے لئے یہ سودا منافع بخش ہی تھا۔ یوں بھی زینو اپنی دوا سے بچی کھچی رقم بغیر گنے ہی چائے کی پیالی میں اُلٹ آتی تھی۔ فیقے کا حساب کتاب سدا نفع کے کھاتے میں رہتا۔

مگر زینو کی عمر اور جوانی نقصان کے کھاتے میں لکھی گئی تھی چونکہ نقصان صرف

زینو کا ہوا تھا اس لیے کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ یہ جاننے کی کسی کو ضرورت نہ تھی۔

زینو جھونپڑی کے اندر لیٹی رات گئے تک اکثر اپنی زندگی کا رجسٹر کھولے جمع نفی کا حساب کرتی رہتی۔ تیرہ سال کی عمر میں چالیس سالہ رنڈوے سے شادی۔ پہلی نفی تین بچوں کی یکے بعد دیگرے پیدائش و اموات۔۔۔ دوسری نفی اندھی بیوہ ماں کا گاڑی تلے آ کر کچلے جاتا۔ تیسری نفی اور پھر جانے کتنی ہی خوشیوں اور مسکراہٹوں کی نفی۔ دکھوں اور آہوں کی جمع کے بعد طلاق والی نفی۔

اس کے بعد تو زینو کی زندگی کے کھاتے میں جمع نفی کی عجیب سی گڑبڑ رہنے لگی۔ مختلف گھروں میں کام کاج کرتے کرتے اچھی اُترن پہننے کو ملنے لگی۔ ڈھنگ کا کھانا پیٹ میں آنے لگا تو جسم کا گداز بڑھ سا گیا۔ پُرکشش نقوش اور کمر تک لمبے بالوں کی چٹیا کے باعث مالکنوں کے بابوں، بیٹوں اور خاوندوں کی عنایات کو وہ جمع کرتی یا نفی، ہمیشہ اسی اُلجھن میں پڑی رہی۔ جسمانی آسودگی کے ساتھ ساتھ مالی آسودگی۔ زینو کو یہ سب اچھا لگنے لگا۔ یوں جمع کا پلہ بھاری رہنے لگا۔ مگر جب عقابی نگاہوں ولی عورتوں نے اُچھلتے بل کھاتے بدن کا جادو سر چڑھ کر بولتے دیکھا تو اپنے ڈھیلے ڈھالے جسموں کو سمیٹ کو گھروں کے دروازے زینو پر بند کر دیئے۔ زینو کے کھاتے میں پھر نفی کا تناسب بڑھنے لگا اور زینو نفی سے ڈرتی تھی۔ سو اس نے براہ راست دکانداری شروع کر دی۔ نئے سرے سے صدیوں پرانا کھاتا کھول دیا۔ یہ کھاتہ خالصتاً اس کا اپنا تھا۔ اپنا مال اپنی اجارہ داری، ملکیت اور حساب کتاب کے جھگڑے سے پاک۔ مرضی سے اپنا گاہک چنتی کہ اس کی آنکھوں میں اب بھی مستی بھری دعوت مچلتی تھی اور سانولا بدن زندہ مچھلی کی طرح بھلواں اور حرارت سے بھرپور تھا۔

آسانیاں، آسودگیاں، زندگی سے ماضی اور محرومیوں کی پھر نفی کرنے لگیں، مگر

یہ پرانے کھاتے۔ کسی نہ کسی حساب میں پھر کھلنے لگتے۔

شاید کوئی پرانا گاہک، لذت کے ساتھ ساتھ کسی لمحے بیماری بھی جمع کر گیا تھا اس کے بدن میں، جو کہیں کسی گوشہ میں پھلتی پھولتی رہی اور زینو کی توانائیوں کی نفی کرتی رہی اندر ہی اندر۔۔۔

وہ تڑپ اُٹھی۔ ایسا زیاں ایسا نقصان اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اب تو۔ ابھی تو آسودگیوں کے نئے در کھلنے تھے۔ انتیس، تیس سال کی زینو کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ اسے گھن لگ چکا ہے، دیمک اسے چاٹ رہی ہے لمحہ بہ لمحہ۔

کئی دن وہ منہ لپیٹے پڑی رہی، مگر دکانداری میں تو اپنا فائدہ ہی دیکھا جاتا ہے۔ سو وہ پھر نئی جگہ پر نئے بورڈ کے ساتھ دکان کھول کے بیٹھ گئی اور بےخبر گاہکوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگی۔ شاید ہر کھوٹے مال والا زندگی کے بازار میں ہی (   ) کرتا ہے اور زینو جیسی عورت کے لیے تو بہت سے جواز بھی تھے۔ اپنے کھوٹے مال کو چمکا لشکا کر پیش کرنے کے۔۔۔ مگر کب تک؟

کچھ باخبر گاہک آ بھی گئے۔ بےخبروں کو محتاط کرنے کے لیے زینو کو دکان پھر بڑھانا پڑی۔ اب وہ جلدی جلدی ٹھکانے بدلنے لگی۔ فٹ پاتھ، بس سٹاپ، ریلوے سٹیشن کوئی نہ کوئی تنہا شکار ہتھے چڑھ ہی جاتا۔ زینو کو جلدی تھی۔ وقت کی آندھی بہت تیزی سے اس کا سب کچھ اُڑانے پر تل چکی تھی۔

کچھ عرصہ بوڑھے مزدوروں، سال خوردہ تانگے بانوں اور گھن لگے ریڑھی والوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔۔۔ مگر کھوکھلے بدن کے ساتھ زندگی میں کہیں کہیں جمع کا نشان لگانے کی کوشش بھی کی مگر حاصل نفی ہی رہا۔

زینو وقت سے پہلے ہی عمر اور بیماری کا کھاتہ اپنے وجود پر لادے کچھ عرصہ گلیوں

میں بھیک بھی مانگتی رہی۔ وحشت سے جلتی آنکھیں اور نا آسودگی کی لُو میں پھنکتا بدن کچھ منچلوں کو اپنی جانب بلاتا بھی تھا، لیکن زینو کا ماضی کہیں نہ کہیں سے سانپ کی طرح سر اُٹھا کر پھنکارتا اور انھیں ڈرا دیتا۔

زینو کی وحشت سوا ہو جاتی۔ کوئی مشین سالہا سال کھٹ کھٹا چلتے چلتے اچانک بند ہو جائے تو پرزوں کو بھی شاید یک لخت رُک جانے سے شاک لگتا ہے۔ تبھی تو ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ زنگ لگ جاتا ہے اور زینو تو جیسی جیتی جاگتی مشین تھی۔ محرومی کی دھوپ میں چٹختے بدن کو چاٹتا گھن، اسے ہر لمحہ زنگ آلود کر رہا تھا۔ جذبوں کی حرارت کبھی کبھی آگ برساتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ساری دنیا کو اس آگ میں اپنے ساتھ جلا دے مگر شاید اب اس آگ کی کسی کو ضرورت نہ تھی۔ زینو کے منہ سے نکلتی چنگاریاں ہر آنے جانے والے کا دامن جلانے لگیں۔ لوگ پاگل سمجھ کر فاصلہ بڑھا دیتے اور زینو واقعی پاگل ہونے لگتی۔

دو چار بار پولیس اور چند اوباشوں کے ہاتھوں ٹھکائی کے بعد زینو نے شہر سے دُور ٹھکانے کا سوچا۔ اسے انسانوں کے جنگل میں پھرتے آدم کے بیٹوں سے نفرت ہونے لگی تھی جنھوں نے اس کے بدن سے زندگی کی تمام خوشیاں کشید کر کے اس کی نفی کرنے کے بعد ایک چھچھڑے کی مانند پھینک دیا تھا۔ تنہائی اور اکلاپے کے جہنم میں جلتے جلتے اب راتوں کو اکثر تین ننھے منے وجود سسکتے ہمکتے اس کا گھیراؤ کر لیتے۔ وہ جو اس کی کوکھ سے جنم لینے کے بعد شاید اس لیے دنیا سے رُوٹھ گئے کہ یہ دنیا، ان کی ماں کی کوکھ کو گھن لگا کر جلد ہی اسے ٹھکرانے والی تھی۔

ایسی کالی راتوں میں زینو کو کوکھ کے بین سنائی دینے لگتے۔ شاید بچھڑے بچوں کی یاد میں؟ کبھی کبھی کوئی ٹیس اٹھتی تو لگتا کوکھ بددعائیں دے رہی ہے۔ انھیں جو اسے

روگی بنا گئے،۔۔مگر کون۔۔؟ کتنے؟ کوئی ایک؟ چند؟ یا سارے ہی؟؟؟

زینو کو نہ نام یاد آتے نہ چہرے کہ اس کے کاروبار میں نام اور چہروں کی اہمیت نہ تھی۔ صبح تڑکے اٹھ کر جھونپڑی کے باہر ڈبو کو ٹھڈے مار کر، گالیاں دے کر اپنی بھڑاس نکالتی۔ ڈبو بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اتنی ذلت کے باوجود محض چیاؤں کر کے چند قدم دُور جا بیٹھتا اور تھوتنی اگلے پنجوں پر ٹکا کر زینو کو تکنے لگتا۔ جب زینو بک جھک کر نڈھال سی اپنی جھلنگا چارپائی پر بیٹھ جاتی تو ڈبو مرے مرے قدموں سے اس کے پاس آ جاتا اور دُم ہلانے لگتا۔ زینو خالی خالی نظروں سے کئی لمحے اسے گھورتے رہنے کے بعد زیرِ لب کہتی ''مرن جو گیا'' اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں اب آنسو بہت کم آتے تھے۔ شاید سبھی سوتے خشک ہونے لگے تھے۔

اس دن بھی زینو فیقے کے کھوکھے کے پاس جا کر حسبِ معمول بیٹھی تو سہی، چائے بھی پی، کلچے بھی لیے۔ ایک خود کھایا ایک ڈبو کو کھلایا مگر خلافِ معمول وہاں سے اُٹھی نہیں۔ جانے کس سوچ میں گم بیٹھی زمین کریدتی رہی۔ ڈبو بھی تھوتھنی اگلے پنجون پر رکھے اپنی مالکن کے قریب بیٹھا رہا۔ البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اور آنے جانے والوں پر ہلکی سے بھوؤں ضرور کرتا۔ فیقا خوش تھا کہ آج کھوکھے پر رونق بہت تھی۔ ننگی دزدیدہ چھچھلتی اچھلتی نظریں زینو کے وجود سے لپٹتیں۔ معنی خیز سرگوشیاں، فحش فقرے اُبھرتے۔ دوسروں کی زبانی اپنے دل کی بات سن کر رفیق ڈرتے ڈرتے زینو کا ردِ عمل دیکھتا۔ رش ذرا ختم ہوا تو وہ ادھر ادھر جھانکتا زینو کے پاس آن کھڑا ہوا۔

''خیر تو ہے نا آج!'' میرا مطلب ہے، بات بُد بُدا کر اس کے منہ سے نکلی۔ زینو نے وحشت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور لب بھینچ کر سختی سے بولی:

''تجھے تکلیف ہے کوئی''

فیقا گڑبڑا کر اچانک ہی پلٹتے ہوئے بولا ''نہیں! یونہی پوچھ رہا تھا'' غنیمت تھا کہ زینو کا جملہ گو کڑوا مگر اکیلا تھا، کوئی غلیظ گالی ساتھ نہ تھی۔

تبھی ایک ٹرک آن رُکا۔ سامان سے لدا پھدا دو تین آدمی کود کر نیچے اُترے۔ فیقا یوں تپاک سے ملا جیسے برسوں سے جانتا ہو۔ اونچے اونچے قہقہے تھوڑی دیر بعد معنی خیز مسکراہٹوں کا روپ دھار گئے۔ جانے زینو کو کیوں شک ہونے لگا کہ وہ اسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ فیقا چور نظروں سے زینو کو دیکھ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ دو آدمی واپس ٹرک کی جانب بڑھے انھوں نے ایک بوری نیچے لڑھکائی۔ کھوکھے کے باہر بچھی چارپائیوں میں سے ایک پر اسے رکھ کر کھولا۔ فیقے نے اس سامان میں سے کچھ کپڑے ایک چادر اور ایک کمبل نووارد لڑکے کو پکڑایا اور زینو کی جانب بڑھا۔ زینو ابھی تک اس سارے منظر کو بس یونہی دیکھ رہی تھی مگر منظر کا حصہ بنتے ہی اس نے سنا۔ فیقا کہہ رہا تھا؛

''زینو یہ امدادی سامان اوپر پہاڑی علاقوں کی طرف جا رہا ہے تو بھی ضرورت مند ہے رکھ لے''

زینو تڑ سے شاید اسے پھر کوئی جواب دینے ہی لگی تھی کہ فیقے کی آنکھوں میں پھیلا شرمندگی کا خوف اور نووارد لڑکے کے چہرے کی حیرت نے کچھ کہا یا پھر کمبل اور کپڑوں کے نظر میں کھبتے رنگ اور نئے پن کی خوشبو نے کوئی سحر پھونکا۔ زینو کی زبان رُک سی گئی۔

زینو نے لڑکے کے چہرے پر مونچھوں اور داڑھی کی تازہ فصل کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر تمام چیزیں آغوش میں بھر لیں۔

مدتوں بعد نرم و ملائم کمبل اور شل شل کرتے نئے نکور کپڑے بدن سے مس ہوئے تو جانے کون کون سی حِسّیں بیدار ہوئیں اور کون کون سے جذبوں نے آنکھ کھولی۔

حیرت زدہ فیقے نے زینو کی وحشت زدہ آنکھوں میں ایک پل کو وہ شرارہ لپکتے دیکھا جس کی حدت تاروں جیسی ٹھنڈی تھی۔ صرف ایک پل کو۔

زینو نے تمام چیزیں سمیٹیں اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر اپنی جھونپڑی کی جانب چل دی۔ پیچھے پیچھے ڈبو بھی دُم ہلاتا روانہ ہو گیا۔ فیقے نے اس کے گول شانوں اور سڈول پنڈلیوں کو دیکھ کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے نووارد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی حیرتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا؛

''پتہ نہیں کہاں سے آئی ہے۔ زیادہ متھا نہ لگانا اسے ظہورے۔ تھوڑی میٹر ہے، جو مانگے بغیر پیسوں کے دے دیا کرنا''

ظہورے نے ایک نظر اور جاتی زینو پر ڈالی جس کے نیم برہنہ جسم کا اُچھال پہاڑوں سے آئے لڑکے کو منہ زور ندیوں کا سا لگا۔ اس کا بدن اینٹھنے لگا اور گال تپنے لگے۔

زینو دو تین دن کپڑے اپنی جھونپڑی میں رکھے کبھی اندر اور کبھی باہر سوچوں میں گم گھومتی رہی۔ فیقا لڑکوں کے ہاتھوں چائے کا مگ، کلچے اور کھانا بھجواتا رہا۔ مگر زینو نے چائے کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔

''استاد! یہ عورت تو مر جائے گی ایسے۔ تین دن میں تین نوالے بھی نہیں لیے اس نے'' ظہور جانے کس جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر بول پڑا۔

فیقے نے ایک نظر جھونپڑی کے پاس بیٹھی زینو کو دیکھا۔ ظہور کے من کے چور کو پکڑنے کی کوشش میں اپنے دل پر پڑے بھاری پتھر کو لکڑی کے ساتھ تنور میں دھکیلتے ہوئے بولا ''چھوڑ پرے! کون دماغ خراب کرے، بخیے ادھیڑ کر رکھ دے گی، نہیں مرے گی''

یہ اور بات کہ اسے اچانک ہی زینو کی سڈول پنڈلیاں یاد آنے لگی تھیں نظر سینکنے کا اچھا خاصا بہانہ تھا مفت میں۔ فیقے نے رات گئے جا کر زینو سے حال چال پوچھنے کا ڈانواں ڈول سا ارادہ باندھا، مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ رات زینو خود ہی ڈبو کے ساتھ نڈھال سی فیقے کے کھوکھے پر آن کر بیٹھ گئی۔ فیقے سے پہلے ظہور اُس کے پاس پہنچ گیا۔

زینو کچھ زیادہ ہی اُداس لگ رہی تھی۔ سوجی آنکھیں، گالوں پر جمے آنسو، ظہور نے اٹکتے اٹکتے پوچھا'' کھانا کھائے گی؟''

زینو نے اپنی سلگتی آنکھیں ظہور کے متجسس چہرے پر چند لمحے جمائے رکھنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

فیقا بڑھتے ہوئے رَش کو سنبھالنے میں مصروف ہو گیا۔ زینو جانے لگی تو ظہور بلا ارادہ ہی کہہ بیٹھا'' یہ پھٹے پرانے کپڑے پھینک بھی دے اب۔ وہ نئے کپڑے پہن لے نا'' زینو اُٹھتے اُٹھتے رُک سی گئی۔ زمین و آسمان کے درمیان کچھ اَٹک سا گیا۔ اس کی وحشت زدہ نظروں میں جانے کیا تھا کہ ظہور لرز گیا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے برتن اٹھائے اور سر جھکا کر ہوٹل کے پچھلے حصے میں غائب ہو گیا اور جب تک زینو جھونپڑی کے اندر نہ چلی گئی۔ ظہور ہوٹل سے باہر نہ آیا۔

ساری کتھا سن کر فیقا اس پر خوب بگڑا۔

'' تو ماما لگتا ہے اس کا۔ بس دے دیے کپڑے۔ پہنے یا آگ لگائے، تجھے کیا؟ شکر کر تیری ماں بہن کو بخش دیا ہے اس نے۔ اپنے مشورے آئندہ اپنے پاس رکھنا''

مگر ظہور پھر بھی دل کی بات زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکا۔

'' نئے کپڑے ضائع کرنے ہیں کیا؟ پہن کر اچھی خاصی لگے گی۔ خود بھی''

فیقے نے کڑی نظر سے ظہور کے جملے کو تولا؛'' اوئے تو نے کہاں سے دیکھ لی ہے اس کی اچھائی دو دن میں؟''

یہ کہتے کہتے فیقے کی نظروں کے سامنے پھٹے کپڑوں سے جھانکتی زینو کی ساری اچھائیاں اُبھرنے لگیں۔

ظہور کے کانوں کے لویں تپنے لگیں۔ وہ گھبرا کو بولا'' میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا، مجھے کیا؟؟ فیقا اپنے جسم کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے تن کر بولا؛'' جا پھر اس کی فکر چھوڑ اور کام کی فکر کر''

اگلا دن حیرت کدہ تھا۔ صبح سویرے ہی زینو آن دھمکی۔ ایک عدد پانی بھری بالٹی اور صابن کی فرمائش کے ساتھ۔ فیقے کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ ہوٹل کی پچھلی جانب جا کر اس نے ظہور کو عجیب نظروں سے دیکھا اور بولا'' وہ آئی ہے، تیری اماں، تیرے مشورے پر میرا کباڑہ کرنے۔ پانی اور صابن مانگ رہی ہے''

ظہور نے اپنے رنگ بدلتے چہرے پر پانی کا چھینٹا مارا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا؛

'' کیوں؟''

ظہور کے بظاہر پُرسکون ردِعمل نے فیقے کے تن بدن میں آگ لگا دی، جل کر بولا؛

'' ڈوب مرنے کو''

پھر جاتے جاتے کہنے لگا'' جا اب اس کے اشنان کے لیے فرمائش پوری کر اس کی۔ ہونہوں، کپڑے پہنانے چلا ہے ماں کو!''

پورا دن جھونپڑی میں کھڑ پڑ تو ہوتی رہی مگر زینو نظر نہ آئی۔ فیقا اور ظہور ایک

دوسرے سے نظریں بچا بچا کر وقفے وقفے سے اُدھر دیکھتے رہتے۔ مگر ٹاٹ کا پردہ ساکت تھا۔کوئی گہرا راز چھپائے۔

زینو ابھی تک اندر کیوں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟ باہر کیوں نہیں آئی آج؟ اس نے نہا کر کپڑے بدلے یا نہیں؟

یہ سوال فیقے اور ظہور کے ذہن میں کلبلا رہے تھے بار بار، مگر بولنے یا جھونپڑی تک جانے کی ہمت دونوں میں نہ تھی۔ رات گئے ٹریک کا شور کم ہونے کے ساتھ ساتھ کھوکھے کی رونق بھی ماند پڑ گئی تو فیقے کے ذہن میں نئے فتنے نے سر اُٹھایا ''کہیں ایسا تو نہیں کہ زینو نہا دھو کر پچھلی طرف سے کسی کے ساتھ۔۔۔؟''

''نہیں نہیں'' فیقے کی مردانگی نے اپنے شک کو خود ہی رَد کر دیا۔ ویسے بھی زینو مرد تو کیا مرد کے سائے کو بھی دیکھ کر دور ہی سے ایک آخ تھوہ کے ساتھ ساری نفرت زمین کے سینے پر اُنڈیل دیتی تھی۔

فیقا کافی دیر تک چارپائی کی چولوں کی مضبوطی کا امتحان لینے کو کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ دھیرے سے اٹھتے ہوئے بستر پر پڑے ظہور پر ایک نظر ڈالی اور زینو کی جھونپڑی کی جانب چل پڑا۔

اپنے سینے میں ہونے والی دھک دھک اسے اپنے کانوں میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ فیقا ایسا پارسا بھی نہ تھا۔عورت ان چکھی شے نہ تھی اس کے لیے مگر زینو۔کیا خبر شور مچا دے؟؟

اچھی خاصی ساکھ تھی علاقے میں۔ خواہ مخواہ مٹی میں مل جائے، فیقے نے گھبرا کر چاروں طرف یوں دیکھا جیسے واقعی وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ یک لخت اس کے قدموں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

وہ آدھے راستے ہی سے پلٹ آیا۔ دوبارہ لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کی مگر آدم کے خمیر میں کلبلاتے کیڑے کو آرام نہ آیا۔ یہ وہی کیڑا تھا جس نے آدم سے اس کی جنت چھینی۔ اسے اب بھی چین نہ تھا۔ وہی اب فیقے کے وجود میں رینگ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اسے اُکسا رہا تھا۔فیقے نے تنگ آ کر ظہور کو جھنجھوڑا۔

''ظہورے! ظہور یار! بات سن''

ظہور نے میٹھی نیند خراب ہونے پر کڑوا سا منہ بنایا۔ بوجھل آواز میں بولا؛

''استاد کیا مسئلہ ہے آدھی رات کو''

فیقے نے اپنے وجود میں سر اٹھاتے کیڑے کا سر کچلنے کی کوشش میں اپنا لہجہ گھمبیر کر لیا۔

''مجھے لگتا ہے زینو کی طرف گڑ بڑ ہے''

''کیا؟'' ظہور نے آنکھیں پوری کھول دیں۔

''جا دیکھ تو سہی کیا معاملہ ہے؟'' کہنے کو تو فیقا کہہ گیا مگر ظہور کی پھرتی اسے کچھ زیادہ بھائی نہیں جو فوراً ہی اٹھ کر زینو کی جھونپڑی کی جانب چل پڑا تھا۔

فیقے کی تھکی نظریں اندھیرے میں لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتے ظہور کو واپس کھینچنا چاہ رہی تھیں اپنی جانب مگر دیر ہو چکی تھی۔ ڈبو پہلے تو بھونکنے لگا مگر ظہور کی پچ پچ پہچان کر اسے سونگھ کر دُم ہلانے لگا گویا اسے اندر جانے کا پاس مل گیا تھا۔ظہور نے ٹاٹ کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی۔

''زینو۔۔زینو۔۔سب خیر تو ہے نا؟''

خاموشی کی چیخ خاصی ڈراؤنی تھی۔ ظہور نے لرز کر ذرا اونچی آواز میں پکارا ''زینو۔۔زینو'' اور ساتھ ہی ٹاٹ کے پردے کو ہاتھ سے تھوڑا ہٹایا۔ اندر لالٹین کی

ملگجی سی روشنی کے علاوہ پہلے تو کچھ دکھائی نہ دیا مگر جلد ہی چند بے کار سی چیزوں کے ہیولے واضح ہونے لگے۔ چار پائی پر ڈھیر زینو کے وجود کا احساس ہوتے ہی ظہور اس کی جانب بڑھا۔سسکیوں نے اس کے قدم روک دیے۔زینو رو رہی تھی۔جانے کب سے؟لمحوں سے یا صدیوں سے۔۔؟

ظہور نے پوچھا ''سب ٹھیک تو ہے نا؟''

سسکیاں تھم سی گئیں۔ڈھیر میں حرکت ہوئی۔زینو نے ہولے سے سر اٹھایا۔ ظہور پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کر بیٹھ گئی؛''تُو اس وقت یہاں؟'' زینو کی آواز بے نام سے تاثر سے بوجھل تھی۔

''وہ۔۔وہ ہم سمجھے شاید ادھر کوئی ہے'' استاد نے کہا۔۔۔

ظہور اتنی رات گئے اپنی موجودگی کی وضاحت کر رہا تھا کہ زینو نے لالٹین کی لو اونچی کر دی۔ظہور پر کسی اور ہی دنیا کا ظہور ہونے لگا۔کنکھوں سے اَٹے کھچڑی بال ڈھل کر زینو کی کمر تک لٹک چکے تھے۔نئے کپڑوں میں لپٹی صاف ستھری زینو صبح والی زینو سے الگ ہی کوئی ہستی دکھائی دے رہی تھی۔ظہور غیر محسوس طریقے سے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔

''کیوں؟ ڈر کیوں گیا ہے؟ میں زینو ہی ہوں!''

ظہور واقعی گھبرا گیا تھا۔اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگی تھیں۔

''آج تو میں بھی خود سے ڈر گئی ہوں''

زینو نے اپنی بات کا خود ہی جواب دے دیا۔لالٹین کی لَو اونچی کرنے کے بعد وہ نیچے جھکی تو کھلے فیشنی گلے سے چھلکتے اُچھال نے ظہور کے گلے میں پیاس کا پھندہ سا ڈال دیا اس کے قدم اُکھڑنے لگے۔۔

''میں۔۔۔میں۔۔چلتا ہوں''

زینو لالٹین نیچے رکھ کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی ''آ گیا ہے تو چند گھڑی بیٹھ جا۔ جانے کب سے اکیلی ہوں'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں سناٹا بولنے لگا تھا۔ظہور جیسے کسی خواب میں سانس لے رہا تھا۔یہ وجود۔۔یہ لہجہ۔۔۔کیا یہ زینو ہی ہے۔

وہ زینو ہی تھی اپنی تمام تر حسرتوں اور محرومیوں سمیت اس نے خود سے دو تین بالشت اونچے ظہور کو دیکھا،جس کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی اور چوڑے چکلے ہاتھوں سے جڑے بازوؤں کی مچھلیاں قمیض کے نیچے بھی پھڑک رہی تھیں۔جانے کتنی ہی بھولی بسری کراہیں۔زینو کے وجود سے لپٹ کر رونے لگیں،نسوں میں بہتا لہو دوڑنے لگا۔اتنا تیز کہ وہ ہانپنے لگی۔یوں جیسے پھٹ جائے گی۔بھک سے اُڑ جائے گی خود کو بچانے کی خاطر اس نے ظہور کا سہارا لیا۔ظہور کے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیاں زینو کے سینے کے اچھال سے ٹکرائیں تو طوفان آ گیا۔بے ترتیب سانسوں کے درمیان خود کو بچانے کی کوشش کرتے ۔ ہانپتے ظہور نے ٹوٹتے ٹوٹتے لفظوں میں کہا

''یہ۔۔یہ۔۔یہ تُو کیا کر رہی ہے تُو تو میری ماں جیسی ہے''

زینو شل کرتی نئی نکور قمیض کا دامن اوپر تک اُٹھاتے ہوئے سسکی ''مگر ماں تو نہیں'' آج وہ شاید آدم کی نسل سے اپنے سارے اگلے پچھلے کھاتوں کا حساب بے باک کر کے نفی کر دینا چاہتی تھی۔اسے زندگی سے یا شاید زندگی کو اس سے۔۔۔

باہر بے چینی سے پہلو بدلتا فیقا آخر کار چار پائی سے اٹھ کر جھونپڑی کی سمت چل پڑا۔

☆☆☆

دائرے

ان کی تعداد شاید پانچ تھی یا دس۔۔۔؟ وہ سینکڑوں میں تھے یا ہزاروں میں۔۔۔؟ یہ معلوم نہیں، ویسے بھی تعداد سے کچھ فرق پڑتا ہے بھلا۔۔۔؟

شیطان تو ایک ہی ہے نا۔۔۔اور خدا بھی ایک۔۔۔۔

ان سب نے سر جوڑے اور باہمی مشورے سے ایک بچھڑا بنایا۔۔۔اس کی آرائش وزیبائش کی اور اسی کی پوجا شروع کر دی۔

وہ دن بھر ایک دوسرے سے منہ موڑے۔۔۔اپنے اپنے سورج کی پوجا میں مصروف رہتے جو وہ خود اپنے اپنے کھیتوں میں اگاتے تھے۔کسی کا سورج بڑا تھا اور کسی کا چھوٹا۔۔۔!

جس کا سورج جتنا بڑا تھا وہ اتنی ہی بڑی کھیتی کا مالک اور اس کے اتنے ہی زیادہ حواری تھے۔۔۔ جتنے حواری زیادہ تھے اتنی ہی اس کی شکارگاہ وسیع تھی۔

چھوٹے سورجوں والے چھوٹی کھیتیوں کے مالک جو بڑے سورجوں اور بڑی کھیتیوں کو حریص نگاہوں سے تکتے رہتے۔

رات آنے پر وہ سب فراغت کے لمحوں کو اپنے اپنے سورجوں، اپنی کھیتیوں اور اپنی اپنی شکارگاہوں کے حجم کے حساب سے گزارتے۔

ہاں چند لمحے وہ سب ضرور مل بیٹھتے کہ بچھڑے کی نذر نیاز کے چند دستور تھے، چند خاص رسومات تھیں، جو ان سب کو بچھڑے کے حضور ادا کرنا ہوتیں کہ یہ سب کچھ اُن کی بقا کے لئے بہت ضروری تھا۔

انہوں نے اپنے بڑے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ ایسے ہی ایک بچھڑے کی پوجا ہزار ہا سال پہلے بھی ایک قوم نے شروع کی تھی لیکن وہ قوم چونکہ اجڈ وحشی اور غیر مہذب تھی لہٰذا اس کو بچھڑے کی پوجا کا صحیح طریقہ نہ آیا اور بچھڑا اس سے چھین لیا گیا۔

آنے والے ادوار میں بھی بچھڑے کو بار بار پوجا گیا۔مختلف حیلوں سے، حربوں سے، مختلف اشکال میں۔۔۔مگر وہ بات نہ بنی۔شاید ان قبیلوں میں وہ خصوصیات نہ تھیں جو بچھڑے کی پوجا کرنے والوں میں پائی جانی ضروری تھیں۔ان کا عقیدہ شاید خام تھا۔ پھر ایسا بھی تو ہوتا تھا کہ کہیں سے کچھ پراسرار سے لوگ آ جاتے تھے جو دھیرے دھیرے شہر میں پھیل جاتے تھے۔لوگوں کے دلوں میں بچھڑے کے متعلق شکوک وشبہات کا زہر انڈیلنا شروع کر دیتے۔ ان کی سرگوشیاں ان کی رگوں میں سرایت کرتی جاتیں اور بچھڑے سے نفرت بڑھتی جاتی۔۔۔ یہاں تک کہ لوگ ڈانواں ڈول ہونے لگتے۔کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔۔۔جو ہوا کی زبانی ادھر ادھر پھیل جاتی۔۔۔ پہلے لوگ چپکے چپکے پھر اونچے سروں میں بچھڑے کو لعن طعن کرنے لگتے۔ٹولیاں بنا بنا کر اس کی ہرزہ سرائی کرتے اور آخر کار ایک دن بچھڑے کے ناک، کان، دم اور ٹانگیں توڑ کر اسے شہر سے باہر کہیں دُور ریت میں دفنا آتے۔

شہر پر ایک خاموشی سی طاری ہو جاتی جو پرسکون سی لگتی۔ آہستہ آہستہ ایک پراسراریت فضاؤں میں تیرنے لگتی۔ پراسراریت کے بطن سے بے چینی جنم لیتی اور کلبلاہٹ سے سارا شہر بھر جاتا۔ایک دوسری قسم کے لوگ اندر ہی اندر شہر کو دیمک کی

طرح چاٹنے لگتے۔۔۔دیواریں کمزور ہونے لگتیں تو شور شرابا شروع ہو جاتا۔ بھنبھناہٹ کی صورت بچھڑے کی واپسی کا تقاضا شروع ہوجاتا۔

گلیوں میں، بازاروں میں، ہوا میں، سرخ رنگ حلول کر جاتا۔ دیمک کے حواری ٹولہ بنا کر جاتے اور ریت میں دبے ہوئے سال خوردہ، کہن زدہ مٹیالے بچھڑے کو نکال لاتے۔ اسے شہر کے بیچوں بیچ نصب کر دیا جاتا اور اس کی صفائی ستھرائی کا کام شروع ہوجاتا۔ خوفزدہ لوگ دُور دُور سے نظارہ کرتے۔ ادھر ادھر دیکھتے اور آہستہ سے بچھڑے کو چھو لیتے۔

بچھڑے کو چھو لینا ہی غضب ہوجاتا۔ جانے کیا اثر تھا اس کے لمس میں کہ وہ خود بھی ملامت زدہ ہجوم میں شامل ہوجاتے اور بچھڑے کو رگڑ رگڑ کر مانجھنے لگتے۔ اسے چمکایا جاتا، اس کے تباہ شدہ حصوں کی مرمت کی جاتی، رنگ و روغن تازہ کیا جاتا۔ دانت، سینگ اور کھُر بطورِ خاص تیز کئے اور چمکائے جاتے تا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی ہیبت بٹھائی جاسکے۔

پھر اسے ایک اونچے سے چبوترے پر نصب کر کے اس کے گرداگرد مقدس پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔ عود و لوبان سلگائے جاتے، پروہت پاک و پوتر ہو کر اس کی عبادت کرتے یہاں تک کہ بچھڑا ''مقدس'' ہوجاتا۔

چند پروہت دن رات اس کی مدح سرائی کرتے۔ ایسی رسومات اور عقیدوں کو عام کرتے جو اسے شہر والوں کا نجات دہندہ ثابت کرتے لیکن ہوتا یوں کہ شہر والوں کے چولہے ٹھنڈے پڑنے لگتے۔ خوف کا بھوت گھروں میں چکر لگانے لگتا۔ بھوک اور پیاس کے مارے لوگوں کی آنکھیں اُبلنے لگتیں اور ٹانگیں سوکھ کر زمین سے جا لگتیں اور وہیں چپک جاتیں۔ وہ رینگ رینگ کر چلتے۔ سر اٹھا کر چلنا ان کے لئے ناممکن ہو

جاتا۔ ان کے کان کوئی اُلوہی راگ سننے سے معذور ہوجاتے۔ انہیں صرف بچھڑے کے مقدس پروہتوں کی آوازیں سنائی دیتیں جو دن رات کے ہر پہر ان کے کانوں میں گونجتیں۔

صدیوں زمین پر رینگتے رینگتے ان کے جسم بے حس ہوجاتے۔ کہیں سے تازہ ہوا کی ایک لہر اُنہیں چھو چھو کر ایک نئے احساس سے آشنا کرنے لگتی۔ یہ لمس انہیں گہری مصنوعی نیند سے چونکا دیتا۔ وہ اپنے جسموں پر ہاتھ پھیرتے تو محسوس ہوتا کہ ان کے جسم نرم پڑ رہے ہیں۔ وہ اس ہوا کو سونگھنے کی کوشش کرتے، جس کی خوشبو انہیں مست کرنے کی بجائے چوکنا کر دیتی۔ وہ اپنے اطراف کا جائزہ لیتے۔ ان کے رینگنے کی رفتار تیز ہوجاتی حتیٰ کہ وہ چلنے اور پھر بھاگنے پر مجبور ہوجاتے یہاں تک کہ ان کا رخ بدل جاتا اور وہ بچھڑے کی مخالف سمت بڑھنا شروع کر دیتے۔ پروہت انہیں چاروں طرف سے نرغے میں لے کر عود و لوبان کی خوشبو سے غافل کرنے کی کوشش کرتے اور انہیں ایک دائرے میں چلنے پر مجبور کرتے، کچھ تو زمین سے جا لگتے اور پھر کبھی نہ اٹھ پاتے۔

چند دوسرے پروہتوں کا حلقہ توڑ کر شہر کے کونوں کھدروں میں جا چھپتے۔ پہلے سرگوشیوں اور پھر نعروں کی صورت وہ بچھڑے کی پوجا کے خلاف بولتے۔ ان کی آوازوں کی گونج سے پورا شہر ڈولنے لگتا۔ پروہتوں کے لباس تار تار ہونے لگتے۔ مقدس برتن ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگتے۔ باغیوں کے خوف سے پروہت تہہ خانوں میں جا چھپتے۔ بچھڑا بے چارہ پھر سے اپنی چمک کھونے لگتا۔

یہاں تک کہ چند سرپھرے اسے جلوس کی صورت شہر بدر کر دیتے۔

وقت کا پہیہ گھومے جا رہا تھا۔ بچھڑے کے پجاریوں اور سرپھروں کے درمیان

جنگ جاری تھی۔ کبھی پجاری پہیے تلے کچلے جاتے اور کبھی سر پھرے۔

مگر اس مرتبہ بچھڑے کی جو پوجا شروع ہوئی وہ کچھ عجب طرح کی تھی۔ اس مرتبہ مسئلہ صرف بچھڑے کا ہی نہیں تھا بلکہ بہت سارے سورج بھی تو تھے، جن کی عبادت بھی واجب تھی۔ لوگوں کو اب نہ تو کچھ محسوس کرنے کا وقت ملتا تھا اور نہ ہی ہوا کی خوشبو سونگھنے کا۔

زمین پر رینگ رینگ کر چلنے سے ان کی ٹانگیں لجلجے گوشت میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ سورج کی پوجا نے ان کی کمروں میں بڑے بڑے کُب پیدا کر دیئے تھے۔ آنکھیں، روشنی اور اندھیرے میں تمیز نہ کر سکتی تھیں۔ اپنی ناک سے آگے کا منظر دیکھنے سے قاصر تھے۔ بچھڑے کے آگے ماتھا ٹیکنے کے باعث ان کے سروں پر بڑے بڑے گومڑ اُبھر آتے تھے جو دھیرے دھیرے نوکیلے سینگوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر شخص دوسرے کے راستے میں آنے سے گریزاں تھا مبادا کہ سینگ اُسے نہ چھو جائیں۔

سبھی کے سینگ نوکیلے تر ہوتے گئے حتیٰ کہ پیدا ہونے والے بچے بھی یہ تمام سوغاتیں لے کر آنے لگے۔

صدیوں بعد ایک رات کے پچھلے پہر نے بڑی حیرت سے اس نوزائیدہ بچے کو دیکھا، جس کی ہیئت والے بچے کی پیدائش کی گواہی پچھلی صدیوں نے نہ دی تھی۔ اس کی ٹانگیں سیدھی اور جاندار تھیں۔ سیدھی کمر اور صاف شفاف ماتھا بغیر کسی سینگ کے۔

ماں باپ نے خوفزدہ ہو کر اس کو اندھیرے کمرے میں چھپا دیا مگر ہوا اور گرد و غبار نے یہ خبر پروہتوں تک پہنچا دی۔ تعجب نے کئی چہروں کے زاویئے بدلے

کہ ایسے بچوں کا ذکر تو پرانی کہاوتوں میں ملتا تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ بڑا ہو کر ان جیسا ہی بن جائے۔ نہ بھی بنے گا تو بنا دیا جائے گا۔'' سو وہ بے فکر ہو گئے۔

پھر ایک دن اسی نوجوان نے جوانی کی دیوی کو اپنی آغوش میں لیا اور اپنی توانا چال کے ساتھ سیدھی کمر اکڑائے، اپنے روشن ماتھے کو سورج کے آگے ٹیکے بغیر سیدھا بچھڑے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسی نے لجلجی ٹانگوں والے، رینگتے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ ان کے نوکیلے سینگوں کی نوک پر غور کیا اور زور سے ایک لات بچھڑے کو دے ماری۔

ایک دھماکہ ہوا۔ صدیوں پرانی خاک اُڑ کر کبڑے لوگوں کے چہروں پر جمنے لگی۔ وہ چلانے لگے۔ ان کی نظر جو پہلے ہی ناک سے آگے نہ جاتی تھی، دھندلا گئی۔ نوجوان نے پتھرائی ہوئی آنکھوں والے پروہتوں اور شہر کے باسیوں کے سینگ اپنے طاقتور بازوؤں سے اُکھاڑ پھینکے۔ درد کی شدت سے بے حال لوگوں کو یوں لگا جیسے ان کی ٹانگوں میں جان آ رہی ہو۔ ان کی نگاہیں صاف دیکھنے لگیں۔ ان کی کمر کے خم سیدھے ہونے لگے۔ انہوں نے خود کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ خوشی سے بے قابو وہ دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ صدیوں بعد انہوں نے زمین کو اونچائی سے دیکھا۔ انہوں نے نوجوان کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا۔

ان کے تمام سورج گل ہو گئے۔ بچھڑے کے کئی ٹکڑے کرنے کے بعد وہ اسے شہر سے دُور ایک اندھے کنویں میں پھینک آئے تا کہ اسے دوبارہ کوئی وہاں سے نہ نکال سکے۔

کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں تک اس شہر میں سر اونچا کر کے چلنے والے لوگ پید

اہوتے رہے اور وہی نوجوان ان کا سردار ہوا۔

آسمان نے پھر رنگ بدلا۔ ایک رات بڑے زور کی سرخ آندھی آئی، چند لوگوں نے ایک سائے کو شہر سے نکلتے اور اندھے کنویں کی جانب جاتے دیکھا۔ انہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ شخص نہ جانے کس طرح اندھے کنویں میں بآسانی اتر گیا۔ واپس نکلا تو اس کے ہاتھ میں وہی ٹوٹا پھوٹا بچھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے شہر میں داخل ہو گیا۔ جب اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح گھسا تو پیچھا کرنے والوں کی نظریں آپس میں ملیں۔۔۔ حیران مگر فیصلہ کن۔۔۔!

اگلی صبح شہر والوں نے دیکھا کہ شہر کے بیچوں بیچ رنگ و روغن سے عاری بچھڑا نصب ہے مگر اس کے سر کی جگہ اُن کے نجات دہندہ کا سر لگا ہوا ہے۔

☆☆☆

سفید بھالو

رات گھر واپسی پر بھی وہ سفید سفید۔۔۔ روئی جیسا بھالو مونی کو شرارت سے دیکھ دیکھ کر چھپن چھپائی کھیلتا رہا۔ مونی کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ باپ کی انگلی پکڑے مرے مرے سے انداز میں تقریباً گھسٹتا جا رہا تھا۔ موڑ مڑنے تک اُس کی گردن مستقل شیشے کے اس showcase کی جانب مڑی رہی، جو بازار کی بل کھاتی سڑک کے دوسرے کنارے پر تھوڑی اونچائی پر ایک دکان کے چہرے پر مسکراہٹ کی طرح چپکا ہوا تھا اور اس میں کھڑا لال ٹائی والا سفید بھالو سب سے چھپ کر اسے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

باپ نے اپنے سے چند قدم آگے آگے اُچھل اُچھل کر بھاگنے والے مونی کو اِس بار سست روی پر کئی مرتبہ سرزنش کی۔ منیر بیگ کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔۔۔ ایک تو چوٹیوں سے آنے والی ہوا خاصی سرد ہو چکی تھی۔ دوسرے اس کا چھوٹا بھائی انگلینڈ سے پورے دو سال بعد گھر آیا تھا۔ اور اگلے کئی دنوں تک عزیز و اقارب کی آمد کا سلسلہ دراز ہونے کی بھی توقع تھی۔۔۔ زینت نے ایک سگھڑ بیوی اور اچھی بھابی کے طور پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے خلاف معمول آج منیر کو سورج ڈھلنے کے بعد بازار بھیجا تھا۔ تا کہ سسرالی مہمانوں کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔۔۔

جز بز تو ہوا تھا مگر معاملہ چوں کہ اس کے اپنے گھر والوں کا تھا، سو بول نہ سکا۔۔۔

موسم بدل رہا تھا۔۔۔ سر سبز بلند و بالا پہاڑ۔۔۔ سرِ شام وادیوں میں در آنے والی خنکی کو نہیں روک سکتے تھے۔۔۔ ایسے میں زینت سے چھپ کر صغیر سے انگلینڈ کی سرد مگر گرم شاموں کے قصے سنتے سنتے کمبل سے نکل کر بازار کی ٹھنڈی سڑک پر چلنا خاصا اذیت ناک عمل محسوس ہو رہا تھا۔

منیر بیگ کے اُٹھتے ہی مونی بھی صغیر چاچا کی گود سے چلانگ لگا کر اُترا اور بازار جانے کی ضد کرنے لگا۔ ماں نے جھاڑا چاچا نے پچکارا، مگر منیر بازار جائے اور مونی رُک جائے! یہ ناممکن تھا۔ زینت نے تنگ آ کر اسے موٹی جیکٹ کے ساتھ ''بندر ٹوپی'' بھی پہنا دی۔۔۔ صغیر ہنسنے لگا۔ مونی کو کالے رنگ کی یہ ''بندر ٹوپی'' بے حد پسند تھی۔ جس میں سے اس کی بلوریں آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔۔۔ سر، کان، ماتھا، ہونٹ سبھی کچھ چھپ جاتا تھا۔۔۔ بات کرنے کے لیے وہ اسے ٹھوڑی پر سے کھسکا دیتا۔ ورنہ اکثر اندر ہی سے گھٹی گھٹی گونجیلی سیٹیوں سے لدی آواز کے ساتھ بولتا ہنستا اور حظ اُٹھاتا رہتا۔ مونی نے اس ٹوپی کا نام خود ہی ''بندر ٹوپی'' رکھ چھوڑا تھا۔

رنگ برنگی ٹافیاں اور چاکلیٹس جو چاچا لایا تھا۔۔۔ آدھی ابھی تک مونی کے پیٹ میں پہنچ چکی تھیں۔۔۔ مزید گنجائش نہ پا کر مونی نے بقایا سنبھال دی تھیں۔۔۔ کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے وہ اُکتا سا گیا تھا فی الحال۔۔۔ اور کپڑے ماں نے اپنی مرضی سے مختلف مواقع کے لیے رکھ چھوڑے تھے کہ اسے خاندان اور محلے بھر میں آنے والی شادیوں، پیدائشوں اور تہواروں کا کیلنڈر ازبر تھا۔

مونی کو منیر بیگ کی گودی چڑھ کر بازار جانے کی ہمیشہ سے عادت تھی۔۔۔ اُونچی نیچی بل کھاتی سڑکوں کے کناروں پر دو رویہ دکانوں کی لمبی متوازی لکیریں۔۔۔

رنگ برنگی قسم قسم کی اشیا گانوں کے بھاؤ تاؤ، گانوں اور شور وغل کی آوازیں مونی کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک طلسماتی سی دنیا کا در کھل جاتا تھا بازار جا کر۔۔۔ اور پھر باپ کوئی نہ کوئی فرمائش بھی تو پوری کر دیتا تھا۔۔۔ کھلونے، جوس، مونگ پھلیاں۔۔ کچھ نہ کچھ مونی کے ننھے ننھے ہاتھوں کی سوغات کا روپ دھار لیتا۔

چلتے چلتے تھک جاتا تو باپ کی جانب گول گوتھنے سے ہاتھ پھیلا دیتا پانچ سالہ مونی کی نیلی شفاف آنکھوں کی التجا ٹالنا منیر کے بس میں نہ ہوتا۔ وہ اسے کمر سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر اپنے سینے میں سمو لیتا۔ لگتا پوری کائنات مونی کے من میں سما گئی ہو، لیکن آج مونی نے اسے واقعی زِچ کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کی فرمائش پر وہ جھنجھلایا تھا۔ کتنی سبکی ہوئی تھی اس کی دکان میں لوگوں کے سامنے۔ زینت کی دی ہوئی فہرست کے مطابق سامان خریدنے کے بعد اس کی جیب میں کل ایک سو بیس روپے بچے تھے اور مونی جس بھالو کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اس کی قیمت چھ سو روپے تھی۔ منیر نے حساب لگایا کہ اگر چھ سو روپے کا یہ بھالو وہ مونی کے لیے خرید بھی لے تو ہفتہ بھر کے راشن میں کمی کرنا پڑے گی، جب کہ صغیر کی آمد کے باعث اگلا پورا مہینہ تین گنا راشن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

منیر نے نیلے نیلے بلوروں کی فریاد ننھے ننھے سرخ ہونٹوں کی سسکیوں اور گالوں پر لڑھکتے موتیوں کو جی کڑا کر کے نظر انداز کیا اور کچھ کہے بنا مونی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ مونی مچلنے منہ بسورنے لگا۔ منیر کے ہاتھوں میں سامان کے شاپر خاصے بھاری ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ چل پڑا۔ مگر ہر چند قدم کے بعد منیر کو رُک کر مڑ کر مونی کو آواز دینا پڑتی، جس کا ننھا سا دل شیشے کے پیچھے موجود روئی جیسے سفید بھالو نے چرا لیا تھا۔

منیر کی آواز پر مونی ٹھٹھک کر ایک بے آواز چیخ کے ساتھ چند قدم چلتا پھر اس کی

گردن پیچھے کی جانب مڑنے لگتی حتیٰ کہ اس کے پاؤں جمنے لگتے۔منیر نے تنگ آ کر دونوں شاپر داہنے ہاتھ کی مختلف انگلیوں میں ٹھنسا کر لٹکائے اور بائیں ہاتھ سے مونی کا سیدھا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

مگر مونی کا ہاتھ مونی کا دل بن چکا تھا۔دھڑکتا، پھڑکتا، مچلتا۔۔۔اُس تار سے بندھا۔۔۔جس کے دوسرے سرے پر ٹائی والا سفید بھالو بیٹھا تھا۔

منیر نے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر لی اور مونی کو تقریباً گھسیٹتا ہوا لے چلا۔۔۔اسے ڈر تھا کہ مونی کی بندر ٹوپی سے جھانکتی آنکھوں سے بہتا دھارا۔۔کہیں اسے بہا نہ لے جائے۔

مسلسل روتے رہنے سے سوجی سرخ آنکھوں اور سسکیوں نے زینت کو ہولا سا دیا۔

''کیا ہوا میرے مونی کو!۔۔۔''

مونی بانہیں پھیلا کر ماں سے لپٹ گیا اور باپ کو شاکی نظروں سے دیکھ کر بولا

''سفید بھالو۔۔۔''

ساری کہانی سننے کے بعد صغیر نے فوراً جوتے پہنے اور تیار ہو گیا کہ ابھی مونی کو وہ سفید بھالو دلوا دے۔۔۔جانے منیر نے کیا سوچ کر اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

''اب دکان بند ہو چکی ہے۔۔۔صبح سہی۔۔۔!''

''صبح سہی۔۔۔''

یہ دو الفاظ مونی کے لیے نویدِ حیات تھے۔ نیلے نیلے بلور چمکنے لگے۔''سچ ابو'

منیر نے مسکرا کر اُس کی لال بندر ٹوپی اُتاری اور سنہری بالوں کو پیار سے بے

ترتیب کر دیا۔

ساری رات سفید بھالو لال ٹائی اور کالی آنکھوں سمیت مونی کے ساتھ ناچتا کھیلتا اور دھپ دھپ چلتا رہا۔

ابھی مونی جاگا نہیں تھا کہ کسی بے ترتیب لمحے میں وقت اور فطرت اپنی چال چل گئے۔۔۔خواب حقیقت سب بکھر گئے، خاک خاک میں جا ملی۔۔۔ایک المیے کی گواہی رقم کر کے لہو بے جان ہو کر پتھروں پر جم گئے۔۔۔شناخت بے شناختی کے مرحلوں سے گزرتی ہوئی۔۔۔کہیں پھر شناسائی اور کہیں کہیں صرف صدا بن کر رہ گئی۔۔۔جس کا جواب کہیں نہ تھا۔کوئی تھا۔۔۔کوئی نہیں تھا۔۔کچھ ادُھورے تھے۔۔کچھ بظاہر مکمل مگر۔۔۔مکمل کی تعریف سے عاری۔۔۔

زندگی کے عناصر کی چند لمحوں کی بے اعتنائی نے صدیوں کی مسافت و رفاقت کو ملبے کے ڈھیروں تلے دفن کر دیا۔

بستیوں میں کوئی آسیب پھر گیا تھا۔۔نوحہ کناں کم تھے اور رفتگاں زیادہ۔

زمین کی گردش تھم گئی تھی یا تیز تر ہوئی تھی کچھ تو تھا۔۔۔کہیں زمان و مکاں کے درمیاں ایسا کہ زندگی زخموں سے چور پھر رہی تھی۔۔۔اور موت دانت نکوسے اس کی تلاش میں تھی۔

مونی کی آنکھ کھلی تو لگا ساری رات بھالو کے ساتھ چل چل کر اور کھیل کھیل کر تھک سا گیا ہے۔۔درد کا ایک احساس پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔۔۔ہچکولے لے رہا تھا۔۔۔

لیکن چند لمحوں بعد گھوں گھوں کی آواز نے اسے سمجھایا کہ وہ کسی گاڑی پر سوار ہے۔

مونی نے بے یقینی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کو پہنچاننے کے لیے اُٹھنے کی کوشش کی تو ایک

چیخ اس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔۔۔دائیں ٹانگ میں جلتی لکڑی شاید گھس گئی تھی۔

اسی لمحے ایک مہربان اجنبی چہرہ اس پر جھکا، نرم لہجے میں بولا۔۔۔

''کیا بات ہے بیٹا۔۔۔درد ہو رہا ہے؟''

مونی نے خالی خالی بلور اس چہرے کی جانب لڑھکائے۔۔۔امی ابو۔۔۔چاچا نہیں یہ چہرہ تو ان میں سے کسی چہرے پر فٹ نہیں آتا تھا۔۔۔

''ہوش تو آ گیا ہے، مگر ابھی بھی shock میں ہے بچہ۔۔۔پہلا چہرہ کسی دوسرے چہرے سے مخاطب تھا۔۔۔

مونی نے حیرت سے سوچا۔۔۔''بچہ۔۔۔؟ کون سا بچہ۔۔۔؟''

مہربان چہرے والے نے اس کا سر زانو پر رکھ کر اسے کچھ بلایا تھا۔گھوں گھوں کی آواز دور جاتی محسوس ہوئی اور مونی کا ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

پھر کئی دنوں تک خیموں (Tents) میں پڑے رہنے کے بعد جب وہ ہسپتال کے ایک بیڈ پر لٹایا گیا تو اس کی صرف ایک ٹانگ اس کا بوجھ بانٹنے کو رہ گئی تھی۔۔اکیلی تنہا۔۔۔مونی کی طرح۔۔۔

یہاں پڑے پڑے پانچ سالہ مونی کو پہلی مرتبہ۔۔۔زندگی، موت، تباہی، بربادی۔۔۔وارث لاوارث۔۔۔یتیم بے گھر۔۔۔اور جانے کتنے ہی دوسرے اجنبی الفاظ کے معنی سمجھ میں آنے لگے تھے۔۔۔

دن رات اجنبی سے تھے۔۔لوگ آتے چلے جاتے۔۔ڈاکٹر آتے چلے جاتے۔امی ابو چاچا کی طرح کوئی نہ اس کے پاس زیادہ دیر رہتا تھا، نہ سوتا تھا۔۔۔، وہ سب کو دیکھتا رہتا ٹکر ٹکر۔۔۔

کچھ لوگ کیمرے لیے بھی آتے۔۔۔فلیش چمکاتے، چمکارتے ٹافیاں کھلونے

کپڑے دیتے اور وہ بھی چلے جاتے۔

پچھلے چند ہفتوں سے اس نے کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ڈاکٹرز (Psychiatrists) کا خیال تھا کہ shock نے اس کی قوتِ گویائی چھین لی ہے۔۔۔ورنہ تو اسے جو کہا جاتا وہ بلا چوں چراں مان لیتا۔۔۔''اٹھ جاؤ بیٹا۔۔لیٹ جاؤ بچے۔۔کھانا کھا لو بیٹا۔۔دوا پی لو منے۔۔۔شاباش بہت اچھا بچہ ہے بات مانتا ہے۔۔۔''

وہ پوچھنا چاہتا تھا ان سے کہ اس کی امی ابو اور چاچا کہاں ہیں۔۔۔وہ جانتا تھا کچھ بہت برا ہوا ہے۔۔۔زمین ٹوٹ گئی ہے اور بہت سارے لوگ مر گئے ہیں۔

شاید اس کے گھر والے زندہ ہوں کسی دوسرے ہسپتال میں!، مگر مونی کے پاس شاید الفاظ ختم ہو گئے تھے۔اس کی آنکھوں کے نیلے بلور اب نہ چمکتے تھے نہ ہنستے تھے۔۔۔ایک دُھند ایک غبار سا چھا گیا تھا۔۔۔

پھر ایک دن وارڈ میں عید کے تحفوں کے ساتھ ایک بھالو آ گیا یہ ویسا بھالو تو نہ تھا۔۔۔سفید لال ٹائی والا۔۔۔مگر تھا تو بھالو اسے دیکھتے ہی نیلے بلوروں کی دُھند چھٹنے لگی۔۔۔شاید عید پر امی ابو بھی آ جائیں۔۔۔اس کے نئے کپڑے لے کر۔۔۔جو چاچا لایا تھا۔مگر رات آ گئی۔۔۔کوئی نہ آیا۔۔۔

گدلا بھورا سا بھالو۔۔ساتھ والے بیڈ پر پڑے اس دو سالہ بچے کا تھا، جس کے سر پر گہری چوٹ تھی۔۔۔اور ایک ہاتھ سے محروم ماں دن رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔۔۔مونی کو رات کے ساتھ ہی سفید بھالو کی یاد ستانے لگی۔۔۔وہ سوچنے لگا کہ اگر زمین نہ پھٹتی تو اگلی صبح چاچا نے اس کے لیے وہ بھالو ضرور خرید لینا تھا۔

جانے کیوں مونی کو ایسا لگا کہ کسی نے یہ ساری تباہی صرف سفید بھالو کو اُس سے

دُور رکھنے کے لیے کی تھی۔۔۔اسے غصہ آنے لگا۔۔۔اس نے ساتھ والے بیڈ پر پڑے بھالو کو دیکھا تو دل بے طرح مچلنے لگا۔۔مونی نے بھورے بھالو کو ہاتھ بڑھا کر چھونے کی کوشش کی دھیرے سے۔۔۔

ایک بازو سے محروم خاموش سی عورت جو کہ اس لاوارث بچے کے لیے کڑھتی اور اسے بہلانے کی آرزو رکھتی تھی۔مسکرا کر بھالو کو مونی کے پاس رکھنے کو اُٹھی۔۔۔اس نے بھالو کو مونی کے ساتھ لٹا دیا۔

''اچھا ہے نا بیٹا!۔۔تمہیں پسند ہے۔۔تم لے لو۔۔۔''مونی نے بھالو پر کچھ دیر ہاتھ پھیرا۔۔۔پھر بغیر کچھ کہے اُٹھ کر عورت کو پکڑا دیا۔۔۔نیلے بلور پھر دُھند میں ڈوبنے لگے تھے۔

عورت کا دل بھر آیا اس نے جھک کر مونی کے ماتھے پر بوسہ دیا بال سنوارے اور آنسو پونچھنے کو مڑ گئی۔

''جانے کس ماں کا کلیجہ کٹا ہے۔ پتہ نہیں بدنصیب زندہ بھی ہے یا نہیں!۔۔۔ہے تو کس حال میں۔۔۔؟''

مونی کیا بتاتا اس رحم دل عورت کو کہ اس نے آخری خواب، جس بھالو کا دیکھا تھا وہ تو سفید سفید روئی جیسا نرم سا تھا۔ یہ سخت سخت گدلا سا بھالو۔۔۔اسے کچھ زیادہ نہ بھایا تھا، مگر اس گدلے بھورے بھالو کی موجودگی نے سفید بھالو کی یاد کو پھر سے تازہ کر دیا تھا۔مونی کا دل یہ سوچ کر ہی تڑپ سا گیا، وہ سفید بھالو بھی کہیں دکان کے ملبے تلے دب کر گندا اور گدلا ہو چکا ہو گا۔۔۔اس کی ٹائی خراب ہو چکی ہو گی۔۔۔ اور۔۔۔اور ہو سکتا ہے اس کا ہاتھ یا پاؤں بھی ٹوٹ گیا ہو۔۔

یہ تصور بڑا تکلیف دہ تھا۔۔مونی نے کوشش کی کہ سفید بھالو کے بارے میں نہ

سوچے۔۔مگر سفید بھالو پھر سے بار بار اسے کہیں دُور سے بُلانے لگا تھا۔

مونی اب سارا دن ایک ٹُک بھورے بھالو کو دیکھتا رہتا۔۔۔اور تصور میں سفید بھالو کے ساتھ اُچھلتا کودتا۔۔۔

رحم دل عورت بھی سمجھی کہ بچہ بھالو کے ساتھ بہل گیا ہے۔ڈاکٹر بھالو سے اس کی دُوری اور کشش کو اس کے کسی لاشعوری خوف سے تعبیر کرنے لگا۔

کئی دوسرے بچوں کی طرح مونی کی تصویریں بھی اخباروں اور ٹی وی پر آئیں۔۔۔مگر کوئی وارث نہ آیا۔۔۔مونی کی قسمت کا فیصلہ اب کسی اور نے کرنا تھا۔کس نے؟ مونی کیا جانے۔۔۔

وہ تو انتظار کی ڈور سے لٹک رہا تھا۔

اور پھر اس رات واقعی زلزلہ آ گیا۔۔۔ایسا زلزلہ جسے مونی نے خود محسوس کیا۔۔۔اس کی زندگی پھر سے تہہ وبالا ہو گئی۔۔۔وارڈ میں اچانک ہی سفید بھالو اپنی کالی آنکھوں اور لال ٹائی سمیت داخل ہوا۔۔مگر اب وہ بہت بڑا ہو گیا تھا۔۔۔اس کے ابو جتنا۔۔۔مونی کو لگا وہ پھر خواب دیکھ رہا ہے۔ سانس سینے میں سمانے سے انکاری ہو گئی۔۔۔جب اس نے سفید بھالو کو بچوں کے پاس جا کر گاتے ناچتے اور Hello کہتے سنا۔۔۔مونی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔۔۔نیلے بلور حیرت سے پھیلتے گئے۔۔۔سفید بھالو نے اپنی لال ٹائی ٹھیک کی اور مجسمہ بنے مونی کے پاس آ کر Hello کہا۔اس کے سنہری بالوں کے گچھوں کو پیار سے بگاڑا۔۔۔(بالکل ابو کی طرح) یخ بستہ بے جان ہاتھوں کو ہاتھ میں لیا۔۔کچھ کہا۔۔کیا کہا؟

مونی کو کچھ پتہ نہ چلا۔۔۔

اور بھالو کوئی ردِعمل نہ پا کر دوسرے بچے کی جانب مڑ گیا۔ بھالو کے آخری لفظ

اور مڑنے کے وقفے کے دوران مونی کے سینے میں ہفتوں سے قید چیخ اچانک آزاد ہوئی۔ چمگادڑ کی طرح پورے وارڈ کا چکر لگا کر سفید بھالو کے سر پر آن کر بیٹھ گئی۔

''سفید بھالو۔۔۔!!'' بہت سارے سر گھومے۔۔نگاہوں میں حیرت در آئی۔۔سرگوشیاں اُبھریں۔

''بچہ بول پڑا۔۔بیڈ نمبر پانچ والا بچہ بولنے لگا ہے۔۔۔ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔ جلدی سے جاؤ۔۔۔''

تیز تیز قدموں کی آوازیں۔۔۔سفید بھالو کا مڑنا پلٹنا۔۔۔مونی تک آنا سب گڈمڈ سا ہونے لگا۔۔۔مونی نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔۔۔نیلے بلور دُور کہیں خلا میں تیرنے لگے تھے۔۔۔

سفید بھالو نے جلدی سے تکیے پر گرتے ہوئے مونی کے سر کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر نے دل کی دھڑکن کو پہچاننے کی سعیٔ ناکام کی مگر وہاں سناٹا تھا۔۔۔گہرا سناٹا۔۔۔اُس نے دُکھ کے انبار تلے دبا سر ہلا کر نیلے بلوروں کے کناروں پر اُگی جھالر کو اپنے ہاتھوں سے گرا دیا۔

کسی sever shock نے بچے کی جان لے لی ہے۔۔۔''

ایک بازو والی رحم دل عورت سسکتے ہوئے بولی ''مگر آج وہ پہلی بار بولا تھا۔۔۔''

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔۔۔''بولا تھا۔۔۔؟ کیا بولا تھا۔۔۔؟''

سفید بھالو نے دھیرے سے costume والا سر علیحدہ کیا اور اپنا کالے بالوں والا سر جھکا کر گھمبیر آواز۔۔۔میں اتنا ہی کہہ سکا۔۔۔سفید بھالو۔۔۔''

☆☆☆

نقب زن

ڈاکٹر نے اس علاقے میں گھر خریدنے سے پہلے خوب جانکاری کر لی تھی۔ صاف ستھرا، اشرافیہ کا علاقہ، جہاں ذاتیات میں مداخلت سے پرہیز کرنے والے، ریشم کے کویا جیسے، اپنے ہی خول میں گھٹ مرنے والے لوگ رہتے تھے۔۔۔بھلے ساتھ والے گھر کو آگ لگ جائے۔۔

ڈاکٹر کو تسلی ہوگئی۔ پس ماندہ علاقے سے نکل کر سعودی عرب جا بسا تھا۔ خوب کمایا، لیکن عورت کو گھرداری کی دنیا تک محدود رکھا۔ پہلی بیوی کم پڑھی لکھی کزن تھی، تین عدد بیٹیاں پیدا کرنے کے باعث مرعوب و مجبور۔ ڈاکٹر اپنے Y Chromose کی کرشمہ سازی سے واقفیت کے باوجود بیٹے کے چکر میں کم عمر نرس کو دوسری بیوی بنا لایا۔ ثمینہ کا احتجاج، آنکھوں کے راستے بہہ کر دوپٹے میں جذب ہو گیا۔۔سعودی عرب میں الگ الگ فلیٹ تھے، سو نہ رابطہ نہ کھچ کھچ۔۔۔دوسرے یہاں شیوخ کے لمبے چوڑے حرم، ثمینہ کے دل کو دلاسہ دیئے رکھتے۔

مگر پاکستان آ کر، اکلوتی بیویوں کا راج دل پر گھونسے چلانے لگا۔ حنا اوپری منزل اور ثمینہ نچلی منزل کی مالکن بن گئی۔

حنا کے ہاں بھی بیٹی کی پیدائش نے ثمینہ کا جی خاصا ہلکا کر دیا تھا۔ 6 سالہ سونی

کی اُٹھان، نئی نسل کی تمام تر خصوصیات سمیت کسی اور ہی سمت کا اشارہ دے رہی تھی۔۔۔مگر بچی سمجھ کر سب فی الحال بے خبر تھے۔روبی کی منگنی، باہر رہنے والے بھانجے سے کر کے ڈاکٹر مطمئن تھا۔۔۔دُور تھا۔فون پر بھی شاذ و نادر رابطہ ہوتا مگر ماں کی موجودگی میں۔۔منگیتر سے رسمی سلام دعا کے دوران ، کتنی ہی میٹھی میٹھی سرگوشیاں دل ہی دل میں دم توڑ دیتیں۔دوسری جانب شاہد کے رومانوی الفاظ کے جواب میں صرف ''جی جی'' کی تکرار ہوتی تو وہ جل کر فون پٹخ دیتا۔۔۔ٹھک کی وہ آواز کئی دن روبی کے دل اور بدن کو سلگائے رکھتی۔۔۔رابعہ خود میں مگن رہنے والی دَبّو سی زندگی سے بےزار نظر آتی تھی۔۔شاید پابندیوں سے گھبرا کر اس نے خواب دیکھنا بھی ترک کر دیئے تھے۔

رہ گئی انجو۔۔پارہ تھی پارہ ، اُس کا انگ انگ بولتا تھا، تھرکتا تھا، آنکھیں ابرو ہونٹ حتیٰ کہ پاؤں بھی ایک خاص ردھم کے ساتھ ہر وقت حرکت میں رہتے ، چاہے وہ لیٹی ہو یا بیٹھی ہو۔۔ماں بار بار ٹوکتی اس حرکت پر۔۔لیکن وہ تو اندر کا کوئی اضطراب تھا۔۔انجو کے بس میں تھوڑا ہی تھا۔۔۔

وہ پورے گھر میں جھونکے کی مانند، کسی شرارے کی مانند گھوم جاتی، ان کہی کہہ جاتی، باغیانہ جملے، اعتراضات، باپ کی آمرانہ مملکت کی شان میں گستاخیاں۔۔۔ ماں کے ہاتھ سبزی بناتے وقت کانپ کانپ جاتے۔۔مگر روبی کی بے زبانی کو زبان مل رہی ہوتی۔حنا انجو کی باتیں سن کر سوکن کی بےبسی پر مسکراتی۔۔۔ثمینہ کی نگاہیں التجا کرتیں۔۔نہ بولو۔۔نہ بولو۔۔کچھ نہ بولو۔۔کچھ نہ کھولو۔

اس سارے قصے میں موٹی بھدی برکتے اور اُس کا میاں گنگو بہت اہم تھے۔۔
اس بےرنگ ماحول میں ایک رنگ دار دھبہ تھا گنگو اور وہ بھی سیاہ کالا۔۔۔

گنگو بس پورا گونگا ہونے سے رہ گیا تھا۔۔۔پورا جملہ۔۔۔پوری کہانی ایک دو لفظوں میں سمونے کا عادی۔۔۔مالکوں کے آگے بیل کی طرح سر جھکائے رکھتا۔۔۔اپنی بدصورت اور بدہئیتی کے باعث گھر اور گھر کی عزت کا Ideal محافظ۔ پردے لگی گاڑیوں کو صرف وہی چلا سکتا تھا، شاپنگ، سکول، کالج کے لئے خواتین اور بچیوں کو لے جانا اُسی کی ذمہ داری تھی۔۔۔

دوسری طرف برکتے کی بدصورتی، دونوں بیویوں کے لئے خطرے کا لال نشان بننے سے قاصر تھی، سو اندرونی محاذ پر امن تھا۔ڈاکٹر شانت۔۔۔مگر دو پلاٹ چھوڑ کر دائیں ہاتھ والے گھر اور پیچھے والے گھر میں بالترتیب دو اور تین عدد کڑیل نوجوانوں کی موجودگی کا انکشاف کچھ بےچینی کا باعث بن گیا۔نئی روشنی کے پروردہ، انگریزی بولتے، برمودا میں ملبوس، گاڑیاں بھگاتے ہلا گلا کرتے، یہ کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان کسی بھی وقت سرخ بتی کا روپ دھار سکتے تھے۔سو گھر کی تمام کھڑکیوں پر باہر کی جانب سے بھی پکی چقیں باندھ دی گئیں۔دیواروں پر کانٹے دار باڑ لگا دی گئی۔۔۔پردے لگی گاڑیوں میں حجاب کے ساتھ ساتھ آنکھوں پر کالے چشمے بھی نصب کرنا ضروری تھے۔تمام ممکنہ حفاظتی اقدامات کے باوجود ڈاکٹر اکثر بچیوں کی صحت چیک کرنے کے بہانے ان کے چہروں اور آنکھوں کو بغور دیکھتا۔کسی ڈھکے چھپے راز کی تلاش میں۔۔۔مگر حیران مردہ لٹکے ہوئے چہرے اور جھکی ہوئی نظریں اسے مطمئن کر دیتیں۔

پھر وہ حسبِ پروگرام، نچلی اور اوپری منزل پر موجود اپنی مملکتوں کو تاراج کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا۔۔۔
بیڈروم کا دروازہ لاک ہوتے ہی مردہ لٹکے چہروں پر عقبس ناچنے لگتا، آنکھوں

میں چمک لہراتی، روبی خوف کی آڑ لے لیتی، رابعہ بے نیازی کا پردہ ڈال لیتی، مگر انجو کا تجسّس اور احتجاج اس کی زبان سے بہہ نکلتا۔۔۔وہ جیب خرچ سے چوری چھپے خریدے ہوئے موبائل پر Internet کھول کر روبی اور رابعہ کو بھی سات جہانوں کی سیر کروانے لگتی۔۔۔وہ دونوں بھی سہمی سہمی سکرین پر بکھرے رنگوں میں الجھتی چلی جاتیں۔۔

گھنٹوں بند دروازے کے پیچھے اُن کی پراسرار خاموشی ماں کو خوفزدہ کرنے لگتی مگر ڈاکٹر اپنی کامیاب حاکمیت کے نشے میں مسکرانے لگتا۔ انجو نے کچن کی کھڑکی کے باہر لٹکی چق میں بڑے طریقے سے درزیں بنا لیں تھیں۔ جن کے درمیانی فاصلے سے اس کی شعلہ اگلتی آنکھیں دائیں بازو والے گھر کے دو سجیلے نوجوانوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ جو جانے کس دنیا میں مست کبھی کبھار ہی نظر آتے تھے۔۔۔البتہ ان کی آوازیں، میوزک، قہقہے چق کے پار کی دنیا کا طلسم عیاں کرتے تھے۔ ان کی بھاری مردانہ آوازیں انجو کے جسم میں سنسنی سی بھر دیتیں۔۔۔انجو کا جی چاہتا ان میں سے کوئی ایک۔۔۔اچانک ہی اسے اپنے کلاوے میں بھر لے۔

ان کی ہنستی کھلکھلاتی سمارٹ سی ماں جب پورچ میں کھڑی انہیں آتے جاتے چومتی تو انجو کے سینے میں سانس اٹک سی جاتی، اس لمحے اس کی سوچ پر بھی سنسر لازم ہو جاتا۔۔

Internet کے ذریعے چوری چھپے کھلا دریچہ اب ایک بہت بڑا گیٹ بن چکا تھا۔ ہر طرح کی آمدورفت کے لئے۔۔۔تینوں بہنیں وقت کی چال اور افتاد کو سمجھ رہی تھیں۔۔۔روبی تو انجو کے احسان تلے دبی تھی کہ گھر میں Internet کی اجازت نہ ہونے کے باوجود انجو نے اپنے خفیہ موبائل کے ذریعے شاہد سے اس کی video

chat ممکن بنادی تھی۔ وہ رات گئے کمبل میں دُبکی، سکرین پر شاہد کے چہرے سے چہرہ ملائے، اُبلتے جذبات کو ٹھنڈا کرتی رہتی۔۔اتنے ماڈرن زمانے میں، اتنے posh علاقے میں ایسے طور طریقے، آس پاس کے لوگوں کو ابنارمل لگے، پھر اپنے کاندھے اُچک کر سب to hell with کے انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔۔۔

رات گئے کبھی کبھار تمام خواتین، ڈاکٹر کے ساتھ ڈربے کی مرغیوں کی طرح، سر پر ڈوپٹے لپیٹے کر بتیاں بجھا کر تھوڑی دیر کو ہوا خوری کے لئے آتیں۔۔ یوں جیسے مچھلیاں سانس لینے کو سطحِ آب پر اُبھرتی ہیں، چند لمحے اور پھر گہرے پانی میں غوطہ لگا جاتی ہیں۔ فرق اتنا تھا کہ مچھلیاں سطح آب پر اُبھرنے اور پانی میں غوطہ لگانے کے عمل میں آزاد تھیں۔۔

ان چند لمحوں کے دوران بھی، دبی دبی، خوف زدہ آوازیں، پراسرار سکوت کو توڑنے میں ناکام رہتیں، سو اندھیرے کی خاموشی میں چند سسکتی سانسوں کا اضافہ کر کے وہ پھر پردوں اور دیواروں میں چھپ جاتیں۔

بقول انجو ''بھیڑ بکریوں جیسی ڈرو عورتوں کے اس گلے میں صرف انجو ہی میں ''کالی بھیڑ'' بننے کے جراثیم وافر مقدار میں موجود تھے۔ کبھی کبھار تو وہ جھنجھلا کر برکتے کی خوش بختی پر ناز کرتی۔ برکتے کو چق کی درزوں سے مالی اور دوسرے نوکروں سے باتیں کرتے، ہنستے دیکھ کر وہ روبی اور رابعہ کو بھی بلا لیتی؛

''دیکھو کتنے مزے سے گپیں لگا رہی ہے۔۔۔آزاد پرندے جیسی۔۔۔کاش میں برکتے ہی ہوتی''

یہ سن کر رابعہ کی غنودگی بھری آنکھیں لمحے بھر کو اُبلتیں اور پھر کہیں دُور ڈوب

جاتیں۔ وہ ہونٹ بھینچ کر وہاں سے کھسک جاتی۔

روبی مسکرانے لگتی کہ شاہد سے طویل گفتگو کے سلسلوں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ گنگو کا اشارہ پاتے ہی برکتے کیوں سارے کام ٹال کر چپکے سے سرونٹ کوارٹر کی راہ لیتی ہے۔

ایک دن رابعہ آخر بول پڑی ''انجو گنگو کو دیکھ کر برکتے کی آنکھیں چمکیں یا وہ اس کے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں جائے۔۔تمہیں کیا مسئلہ ہے؟''

انجو تڑپ کر بولی ''ہر طرف تو مسئلہ ہے۔۔۔اوپر نیچے آگے پیچھے۔۔internet پر۔۔اور ہاں تم بی بی حاجن رات چپکے چپکے کس سے باتیں کر رہی تھیں میرے موبائل پر۔۔۔''

رابعہ صاف مکر گئی ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔۔۔روبی ہوگی شاہد بھائی کے ساتھ۔۔۔'' اور وہاں سے کھسک گئی۔۔۔

تب انجو رخ روبی کی جانب موڑ دیتی گفتگو کا ''سچ بتاؤ شاہد بھائی کے ساتھ باتیں کرتے وقت تمہیں کیسا لگتا ہے۔۔؟ ویسا ہی جیسا۔۔۔جیسا۔۔۔'' پھر چپ کر جاتی۔۔۔روبی واش روم میں اپنے جسم کے کرنٹ کو ختم کرنے کے لئے منہ پر یخ پانی کے چھینٹے مارنے لگتی۔۔

انجو نے اپنے آنچ دیتے جذبوں اور جسم کو بہلانے کے لئے برکتے کا سہارا لیا۔۔۔کمر پر خارش کے بہانے دن میں کئی کئی بار برکتے کے کالے بھدے نرم ہاتھ، انجو کی کمر سہلاتے۔۔۔رفتہ رفتہ انجو کو نشہ سا ہونے لگا برکتے کے ہاتھوں کا۔ ماں نے کئی بار معائنہ کیا مگر نرم و ملائم کمر پر نہ دانے تھے نہ خشکی۔۔۔بس برکتے کے ہاتھوں کی رگڑ کی وجہ سے سرخ سرخ دھاریاں تھیں۔۔۔

جانے رابعہ ایسے موقع پر کیوں غنودگی سے بھری آنکھوں سمیت کسی کونے کھدرے میں غائب ہو جاتی۔۔۔

خارش session کے دوران انجو اور برکتے کے درمیان معمول سے ہٹ کر بھی گفتگو ہونے لگی۔ برکتے اپنے بچپن لڑکپن کے قصے، گاؤں کے معاشقے، کھیتوں میں ملاقاتوں اور شادیوں کی رودادیں بھی چسکے لے لے کر سنانے لگی۔۔ان کہانیوں میں پراسراریت تھی۔۔۔ملفوف رومانی کہانیاں، جسم وجاں کی فتوحات قصے۔۔۔

رابعہ۔۔۔کبھی کبھار ناگواری سے دونوں کو دیکھتی اور کروٹ بدل لیتی۔ ایک دن انجو نے شرارتاً پوچھ لیا ''برکتے اتنے کالے دیو، حبشی جیسے گنگو کے ساتھ کیسے۔۔۔''

برکتے کے کالے رنگ میں گلابی رنگ کی پچکاری سی چلی۔

باجی جی مرد کا پیار، رنگ روپ کا محتاج نہ ہووے جی۔۔۔یہ تو سپ کے ڈنگ جیسا ہووے جی۔۔زہر کے نشے جیسا۔۔۔؟

انجو کے بدن پر سانپ رینگنے لگے۔۔رابعہ چادر تلے کانپنے لگی۔۔۔اسے خیال آیا۔ باپ اوپری منزل میں ہوتا ہے تو ماں بولائی بولائی پھرتی ہے۔۔۔باپ نیچے ہو تو اوپر چیزوں کا پٹخنا اور چلانا بڑھ جاتا ہے۔ شاید زہریلا نشہ اُترنے کا اثر ہوگا!

برکتے کے خارشی اور مالشی session لمبے ہوتے گئے۔۔انجو کے لئے برکتے کے ہاتھ سیاہی چوس بن گئے۔ اس کی ضد، گفتگو کی کڑواہٹ، بغاوت کا زہر۔۔۔ برکتے کے ہاتھ چوسنے لگے۔۔۔دھیرے دھیرے۔۔۔دیر دیر تک۔۔۔!

ماں نے سکھ کا سانس لیا۔۔۔ڈاکٹر کی عدم موجودگی میں وہ کئی بار اب حنا کے ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کرنے چلی جاتی کہ گنگو بچیوں کو لانے لے جانے پر مامور تھا۔۔۔

لیکن سمندر کی پرسکون سطح کے نیچے جوار بھاٹے اُبل رہے تھے۔۔جلد ہی سونامی آ گیا۔۔۔ماں نے سرمنہ پیٹ لیا۔بات انجو کی ہوتی تو 440 وولٹ کا کرنٹ نہ لگتا۔۔۔یہ تو رابعہ تھی۔ ماں نے گنہگار کا نام پوچھا۔۔۔رابعہ ٹکر ٹکر غنودگی لئے آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ برکتے کی طلبی ہوئی۔۔اسے کچھ خبر نہ تھی۔۔۔سب کو سختی سے منع کر دیا گیا کسی کے منہ سے بات نہ نکلے۔۔۔

آخر مار پیٹ کے بعد رابعہ نے گنگو کا نام لے ڈالا۔۔

کہ شہرِ نارسا تک اسی بھدے کالے بے ڈھنگے گنگو کی رسائی تھی۔ Beauty & Beast کا خیال شاید کسی ایسی گھٹن زدہ فضا کے کسی کھلے دریچے سے نکلا ہوگا۔

پردہ دار عورت کہاں جاتی۔۔۔کئی بار اوپر کی سیڑھیاں چڑھی اتری۔آخر ہمت کر کے حنا کے پاس جا بیٹھی۔۔۔اسے مشترکہ شوہر کی عزت کا واسطہ دیا۔۔۔حنا نے طعنہ دینے کو منہ کھولا تو ثمینہ نے اس کی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔''حنا یہ طعنوں کا وقت نہیں۔۔رابعہ اور سونی کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون دوڑ رہا ہے کل کلاں۔۔۔''

حنا نے بات کاٹ کر مدد کا وعدہ کر لیا۔ڈاکٹر نے چند دن تک کراچی جانا تھا،اس کی غیر حاضری میں راز داری کے ساتھ مسئلہ حل کرنے کا سوچا گیا۔آخر حنا کی ٹریننگ کام آنے والی تھی۔۔۔فلائٹ کینسل ہو گئی۔ ڈاکٹر اچانک گھر پلٹ آیا۔ کاروائی جاری تھی۔ڈاکٹر کو ائیر پورٹ چھوڑنے کے بعد چابی مالی کے حوالے کر کے گنگو بیوی سمیت غائب ہو چکا تھا۔گھر کی عزت کا جنازہ ڈاکٹر کے کاندھوں پر رکھ کر۔۔

اور وہ جو بدصورت بھدے گنگو کو گھر پر رکھ کر مطمئن تھا،سر پکڑے اب سوچ رہا تھا''کم بخت بہتر شکل وصورت کا ہوتا تو کوئی نہ کوئی خاندانی پیوند لگا کر ٹاٹ کے ٹکڑے

کو مخمل بنا دیتا''

''پر اب رابعہ کو زہر کا ٹیکہ لگا دوں یا خود زہر پی لوں''!

تبھی وہ رابعہ۔۔۔جس کی آنکھیں روشنی میں پوری کھل نہیں پائی تھیں۔۔چیختی چلاتی اندر سے برآمد ہوئی۔ پیچھے پیچھے بوکھلائی ہوئی ثمینہ اور حنا۔۔۔

رابعہ نے شعلہ اُگلتی آنکھوں سے باپ کو دیکھا اور سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولی''خبردار جو میرے بچے کو مارنے کی کوشش کی کسی نے۔۔۔

گھر میں کسی مرد کو تو آنے دو۔۔۔چاہے وہ گنگو کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔'''

دھڑ دھڑ دھڑ ڈاکٹر پر دیواریں گرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

خوشبودار کچرا

اُس کی زندگی کا چکر کچھ اُلٹا سا تھا۔۔ ہر نئی صبح کے ساتھ باقی لوگ اپنے ''کل'' کا بوجھ، گند، اندر باہر کا سب کچرا، باہر پھینکنے پر تُلے رہتے تھے۔

اور وہ؟۔۔۔ اس کا دن، اس کی صبح، کچرے کو چھاننے، پھٹکنے اور اس میں سے ''کارآمد'' اشیاء کو برآمد کرنے سے شروع ہوتی۔ شاید اس لئے کہ وقت نے ہر ذی روح کے حصے میں کچھ نہ کچھ خواب، عذاب لمحے بانٹنے ہوتے ہیں۔۔۔ جو اسی کو بتانے بھی ہوتے ہیں۔۔۔ اکیلے۔۔ تنہا۔۔ اپنے جسم وجاں پر۔۔۔

دادا کو وقت نے کچرے کے ڈرموں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔۔ ہر گھڑی، ہر پل۔۔۔ وہ کیا کرتا اُس کا رزق جو کچرے سے وابستہ تھا۔۔۔

کھچڑی بالوں، اُلجھی داڑھی اور بدبودار کپڑوں سمیت، وہ زندگی کو سلجھانے کی کوشش میں روز منہ اندھیرے، ''خیرو'' اور ''اَچھے'' کے ساتھ گھر سے نکلتا۔ بڑا سا کینوس کا سفید تھیلا، جو اب سفید کم اور بے رنگ زیادہ دِکھتا تھا۔ کسی مردہ خواہش کی طرح اس کے کاندھے سے لٹک رہا ہوتا۔۔ ''اچھے'' کا تھیلا تھوڑا بہتر حالت میں تھا۔۔۔ جبکہ ''خیرو'' رنگ برنگ اُڑتے ہوئے شاپروں کے ڈھیر سے، شوخ رنگ کے چند شاپر اُٹھا لیتی اور انہیں غباروں کی طرح اُڑاتی، ان دونوں کے آگے پیچھے

بھاگتی۔۔ چلتی جاتی۔۔۔

تینوں کی نظریں اکثر زمین پر مرکوز رہتیں۔۔ کوئی گری پڑی چیز، کوئی بٹوہ، کوئی نوٹ، کوئی سکہ۔۔ کوئی بالی۔۔۔؟

ان کی منزل کوڑے کرکٹ کا وہ ڈھیر ہوتے۔۔۔ جو بڑے بڑے ڈرموں کے پیٹ سے باہر اُبل رہے ہوتے۔۔۔ یا پھر کسی سڑک کے کنارے، کسی بستی کے عین درمیان میں اوندھے منہ پڑے ہوتے۔ وہاں اکثر ان کا ''بزنس'' خراب کرنے کے لئے انہی کے بھائی بندوں کے علاوہ، کتے، بلیاں، کوّے اور کبھی کبھار گدھے بھی موجود ہوتے۔۔۔

خیرو، کتوں، بلیوں اور کوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتی۔۔۔ کبھی شش شش۔۔ ہُر ہُر کر کے انہیں دُور بھگاتی۔۔۔ اور کبھی گلے سڑے پھلوں اور کھانے پینے کی اشیاء کی دعوت پر بلاتی۔۔ کوڑے کے یہ ڈھیر۔۔ اس کے لئے ایک نیا آسمان ہوتے۔ ویسا ہی آسمان جو کبھی مہربان اور کبھی نامہربان ہوتا ہے۔۔۔

دادا اور اَچھا، خیرو کے اسی کھیل کو دلچسپی سے دیکھتے بھی اور کئی بار اسے ڈانٹنے لگتے۔۔۔ خیرو اپنی میلی آستین سے بہتی ہوئی ناک کو پونچھتے ہوئے۔۔ جانوروں سے اٹھکیلیاں کرتی رہتی۔۔ حتیٰ کہ دادا واپسی کا بگل بجا دیتا۔

سنہری اُلجھے ہوئے بال، پسینے میں بھیگتے رہتے اور وہ روتی رہتی، جانے وہ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں جیسی صابر و شاکر کیوں نہیں تھی؟ بقول اَچھے کے ''۔۔ نواب زادی کی ضدیں تو صاحبوں کی بیٹیوں جیسی ہیں۔۔۔ شکل نہیں دیکھتی اپنی بھوتنی۔۔''

ویسے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔۔ خیرو کا چلانا، رونا، ہنسنا ایک جیسے تھے۔۔۔ بے کار۔۔۔ بے اثر۔۔

اتنی بڑی کائنات میں خیرو کے آنسو دیکھ کر بس دادا اور اَچھے کا ہی دل دُکھتا تھا۔۔۔اور اَچھے کو تو، اپنے جذبات کے اظہار کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا۔۔

ایک دن خیرو کو کوڑے کے ڈھیر سے ٹوٹی پھوٹی گڑیا مل گئی۔۔۔

مانو خزانہ ہاتھ لگ گیا۔۔۔چمکتی آنکھوں اور کھلتے چہرے کے ساتھ اُس نے اَچھے کو گڑیا دکھائی۔۔۔مٹی میں اَٹی، بگڑی صورت والی گڑیا دیکھ کر اچھے کا جی تو چاہا کہ وہ خیرو کو نئی نکور سی لش پش سی گڑیا لا دے۔۔۔

مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے خیرو کو چڑا دیا۔''لو اُٹھا لاتی ہے کانی، لولی لنگڑی گڑیا۔۔۔شکل تو دیکھ اس کی منحوس بدرنگ۔۔پھینک پرے۔۔۔''

خیرو کے احتجاج پر، دادا اَچھے کی اچھی خاصی کھنچائی بھی کر دیتا مگر ایسے موقع پر اَچھے کی زبان، اس کے دل و دماغ کا ساتھ نہ دے پاتی۔۔جانے کیوں؟

عالی شان گھروں کے ساتھ نالہ تھا۔۔۔درختوں اور جھاڑ جھنکار سے اَٹا۔۔۔دوسری جانب کچی بستی کے ایک کونے پر اُن کا آشیانہ تھا۔۔گھاس پھوس۔۔کچی اینٹوں اور گارے سے بنا ہوا۔۔۔رات گئے لالٹین کی روشنی میں تینوں کوڑے سے چنی ہوئی اشیاء کی چھانٹی کرنے بیٹھ جاتے۔۔بوتلیں، ٹوٹے جوتے، پرانے کپڑے۔۔۔گلا سڑا فروٹ۔۔پلاسٹک کی چیزیں ۔۔برتن کھلونے سارا سامان، الگ الگ ڈھیریوں میں بٹتا چلا جاتا۔۔خیرو اپنی پسند کی چیزیں ایک جانب کرتی جاتی۔۔اَچھا شرارت سے خیرو کی بنی نُھی سے ڈھیری کا ملیا میٹ کر دیتا۔۔

تجربہ کار دادا۔۔تیزی سے ''مال'' کو چھانٹتا ہوا، اَچھے کو گھورتا اور جلدی جلدی کام ختم کرنے کی تنبیہہ کرتا۔۔

خیرو، ہمیشہ کی طرح دادا سے سوال پہ سوال کئے جاتی۔۔وہی پرانے سوال

۔۔کہ

لوگ چیزیں گھر سے باہر کیوں پھینک دیتے ہیں؟

تم اس کوڑے کا کیا کرتے ہو۔۔؟

کیوں کچرے سے چیزیں اُٹھاتے ہو۔۔؟

تم۔۔کچرا لوگوں کو کیوں بیچتے ہو۔۔؟

وہ یہ سارا کچرا اپنے گھر لے جاتے ہیں نا؟ اپنے بچوں کے لئے؟ روز وہی سوال ۔۔۔اَچھا چڑا کر کہتا۔۔''ہاں وہ اس کچرے کا اَچار ڈالتے ہیں اور تجھ جیسی بھتنیوں کو کھلاتے ہیں۔۔''

مگر خیرو جانتی تھی کہ ان سے پیسے مل سکتے ہیں۔جن سے وہ سکول بھی جا سکتی ہے۔جانے یہ اتنی بڑی بات اس کے چھوٹے سے ذہن میں کیسے اور کب سما گئی تھی۔۔

کھلونوں کے ساتھ ساتھ، پھٹی پرانی کاپیاں، کتابیں، بیگ، پن، پنسلیں وغیرہ بھی اس کے خزانے میں جمع ہوتے جاتے۔۔۔

دادا کی آنکھوں میں جلتے خواب دھواں دینے لگتے۔۔اور نمی کناروں سے اُبلنے لگتی۔۔اس ساری کاروائی کے دوران ہی خیرو، ہاتھ میں پکڑی روٹی کھاتے کھاتے، اکثر وہیں چٹائی پر لڑھک کر سو جاتی۔دادا اور اَچھا کسی مقدس فرض کی طرح، اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھتے، چادر اُس پر پھیلا کر اسے یوں تھپکنے لگتے، جیسے زندگی میں اس سے زیادہ اہم نہ کوئی شے ہو اور نہ کوئی کام۔۔

دونوں بغیر کچھ کہے سنے اپنے اس ''دردِ مشترک'' اور ''واحد خوشی'' کے بارے میں سب جانتے اور سمجھتے تھے۔۔۔ان کی محبت کا محور سنہرے بالوں والی یہ جیتی جاگتی گڑیا تھی۔۔جس کا دل، لولی لنگڑی بے جان گڑیوں سے بھی بہل جاتا تھا۔

ویسے رات بھر سپنے میں، وہ نئے نکور کپڑے پہنے، بالوں میں ربن اور کلپ لگائے، لمبی لمبی لال گاڑیوں میں گھومتی، سکول جاتی۔۔پھر اچانک منظر بدلتا۔۔ کوڑے کا ڈرم۔۔بھونکتے غراتے کتے۔۔بکھرتا کچرا۔۔۔وہ سوتے میں کبھی ہنستی، کبھی روتی۔۔یہی اس کے سپنے تھے۔یہی نائٹ میئر کئی بار اَچھا گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا اُس کی چیخوں سے۔۔بڑبڑاتا اور کروٹ بدل کر سوجاتا۔۔دادا اُس کی جھنجھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے ہولے سے کہتا ''یہ خواب ہی تو مفت میں ملتے ہیں۔۔جھلیا! جو یہ بھی بکنے لگے تو ہم پاگل ہوجائیں گے۔۔پکے پکے پاگل۔۔۔''

بارہا رات کو اچانک وہ اُٹھ بیٹھتی اور ضد کرتی کہ اماں ابا کے پاس جانا ہے۔۔۔ دادا خوفزدہ ہو کر اسے گود میں سمیٹ لیتا، اپنی بوڑھی کھردری انگلی اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا۔۔

''نہ۔۔۔نہ ایسا نہ کہہ میری بچی۔۔وہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔۔''

مگر خیرو بحث کرنے لگتی کہ اس کے اماں ابا بھی لمبی سی گاڑی میں آتے تھے اور اسے سکول بھی لے جاتے تھے۔۔۔

تب دادا اس کا دھیان بٹانے کو، سینے سے لگائے لگائے، اس کے میلے چیکٹ سنہری بالوں میں اپنے آنسو چھپا کر پوچھتا۔

''کیسی گاڑی میں آتے ہیں وہ۔۔؟''

خیرو معصومیت سے آنکھیں اور ہاتھ پھیلا کر کہتی۔۔

''اتنی بڑی گاڑی۔۔۔لال رنگ کی۔۔شیشے جیسی۔۔۔میں نے اس میں بیٹھنا ہے دادا۔۔۔ابھی۔۔۔''

اَچھا چادر کے اندر ہی سے ہانک لگاتا۔۔

''پوری کرا ب بھتنیوں کی شہزادی کی فرمائش۔۔''

مگر بھیگی آواز، دادا کو اس کے چہرے پر پھیلی حسرت اور آنکھوں کے ٹوٹے خواب دکھا دیتی۔۔وہ خاموش رہتا۔۔خیرو کو تھپکنے لگتا۔۔یہاں تک کہ اسے بھی اونگھ آجاتی۔۔

لمحے گھنٹوں میں۔۔۔گھنٹے دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلتے گئے۔سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔۔بہار کی آمد کے ساتھ ہی سردی سے سکڑے سمٹے، کچی بستی کے مکین بھی اپنی جھونپڑیوں سے برآمد ہو گئے۔اب رات گئے تک رونق رہتی۔۔۔کیڑے مکوڑوں سے رینگتے، بھاگتے بے دھڑک، ننگ دھڑنگ بچے، ادھر ادھر نظر آنے لگے۔۔کہ بجلی، گیس اور صاف پانی سے محروم ان جانداروں کے لئے سورج، بارش اور ہوا بڑی نعمت تھے۔۔شکر ہے کہ ابھی ان پر نہ ٹیکس لگا تھا نہ بل آتا تھا۔۔۔کچی بستی کے کئی خر دماغوں کے ذہن میں اُلٹے سیدھے خیالات بسیرا کئے رہتے۔۔زبان تک بھی آتے۔۔مگر بستی کی حدود پار کرنے سے ڈرتے۔۔اَچھا اور دادا بھی دو مہینے بعد، میونسپلٹی کے واحد نلکے تلے خوب مل مل کر نہائے۔۔دادا ایک خوشبودار صابن کی ٹکیہ لے آیا تھا۔خیرو تو جھاگ بنا بنا کھیلتی رہی۔۔۔صابن کی خوشبو کائی زدہ، بدبودار جھونپڑی اور بستی پر چھا گئی۔۔۔کچھ عورتوں نے جل بھن کر خیرو کو وہاں سے بھگا دیا۔۔۔ان کا بس خیرو پر ہی چلتا تھا۔۔

خیرو کی بھوری بھوری بلی جیسی آنکھیں اور سونے کے تاروں سے بال دُھل کر نکھر گئے تھے۔۔۔ننھے ننھے ہونٹ، ہاتھ، چہرہ، خراشوں اور روکھی کھال کے باوجود، نتھرے نتھرے سے لگ رہے تھے۔اَچھے نے بے اختیار اُسے اُٹھا کر دو چار چکر دے ڈالے اور اِس کے گالوں کو چوم لیا۔اُس روز خیرو نے گوٹے والا سبز فراک

پہنا۔۔جو دادا اس کے لئے پچھلے سال جمعہ بازار سے لایا تھا۔۔انچ بھر اونچا ہو گیا تھا۔۔مگر پورا تھا ابھی بھی۔۔۔اچھے نے خیرو کے بال کس کر باندھے، گلابی پونی سے پونی ٹیل بنائی۔۔جیسی بازار میں صاحبوں کی بیٹیاں بنا کر پھرتی تھیں۔۔۔دوپہر کو تینوں پھر اپنے دھندے پر نکل کھڑے ہوئے۔۔۔خیرو خوب اِترا اِترا کر چل رہی تھی۔۔۔بار بار اپنے گوٹے والا فراک جھلاتی وہ چابی والی گڑیا لگ رہی تھی۔۔۔اچھا اور دادا جیسے اسے دیکھ دیکھ کر قربان ہو رہے تھے۔۔۔اَچھے نے تو اسے کوڑے کے ڈرم کے پاس جانے سے منع بھی کر دیا تھا۔۔۔جانے کیوں؟

ذرا ستانے بیٹھے تو پوٹلیوں سے رات کا بچا کھچا کھانا نکالا۔۔۔کھانے کے بعد دادا، کچرے کا سودا کرنے قریبی کباڑیئے کے پاس چلا گیا۔

اچھا آتے جاتے لوگوں، کاروں کو دیکھنے لگا۔۔ان گنت، اُلٹی سیدھی سوچیں اس کا گھیراؤ کرنے لگیں۔۔۔کن کھجوروں کی طرح اس کے دل و دماغ اور جسم پر رینگنے لگیں۔۔اتنے میں ایک غبارے والا گزرا۔۔۔

خیرو مچل گئی کہ اس نے غبارے لینے ہیں۔۔خیرو کی آواز سن کر غبارے والے کے قدم بھی سست پڑ گئے۔۔۔

''اَچھے وہ لال غبارہ۔۔۔'' بھوری بھوری آنکھوں میں لپکتی خواہش، اچھا رد نہ کر سکا۔جیبیں ٹٹولیں۔۔کل 10 روپے نکلے اور غبارے کی قیمت 20 روپے تھی۔۔اچھا مایوس ہو گیا۔۔مگر خیرو کی آنکھوں میں لال غبارے کا عکس جھلملا رہا تھا۔۔اَچھے سے رہا نہ گیا، اُس نے غبارے والے سے بحث شروع کر دی۔

''یار دیکھو ہم بھی تیرے جیسے مزدور ہی ہیں نا۔۔کچھ لحاظ کر لے۔۔''

اَچھے کو وقت نے بہت سے لحاظ اور بدلحاظ لہجے چھوٹی عمر میں ہی سکھا دیئے

تھے۔منہ بسورتی خیرو کو دیکھ کر شاید غبارے والے کو اپنی بہن یاد آ گئی تھی۔وہ غبارہ الگ کرنے لگا۔۔تو قریب ہی ایک کار کے بریک چرچرائے۔۔لش لش کرتی، مست ہاتھی جیسی کار میں سے ایک بچے نے سر نکالا اور چہکا۔''ماما۔۔۔وہ Red balloon۔۔''

غبارے والے کا ہاتھ رک گیا۔۔۔ایڑیاں گھومیں اور رخ کار کی جانب مڑ گیا۔۔'' کتنے کا یہ Red balloon۔۔'' کار کے اندر سے آواز آئی۔

غبارے والے نے کار کو دیکھا۔حساب کتاب جوڑا اور بولا۔۔

''40 روپے کا ہے۔۔آخری بچا ہے لال غبارہ۔۔''

جھٹ سے ایک ہاتھ نے 40 روپے بڑھائے۔۔غبارہ کار کے اندر چلا گیا اور گاڑی زن سے خیرو کی بھوری بھوری آنکھوں کے عکس کو کچلتی ہوئی گزر گئی۔۔۔یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ خیرو کو رونے کی بھی فرصت نہ ملی۔۔۔اَچھا ہکا بکا سا دیکھتا رہ گیا۔۔ایک سونامی آیا اور کتنی ہی خواہشوں کو بہا کر لے گیا۔۔تڑ تڑ جیسے گولیاں چلنے لگیں۔۔اچھے کا بدن بھڑ بھڑ جلنے لگا۔۔خیرو اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔۔

''میرا لال غبارہ۔۔۔اَچھے۔۔۔میرا لال غبارہ۔۔ اوں۔۔ اوں۔۔ اوں۔۔۔''

اَچھے کے دماغ کا غبارہ بھی بھک سے پھٹ گیا۔۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور غبارے والے پر پل پڑا۔۔۔تمام غبارے سڑک پر بکھر گئے۔۔اَچھا غصے سے لال بھبھوکا ہوا گھونسے پر گھونسہ مار رہا تھا۔۔آخر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔۔غبارے، سڑک، راہ گیر، گاڑیاں،۔۔سب سے بے پرواہ۔۔خیرو کی چیخیں، کاروں کے ہارن میں دبتی جا رہی تھیں۔

دادا کہیں بیٹھا کچرے کا حساب کتاب کر رہا تھا۔۔اور وقت ان سب کا حساب کتاب!

پتہ نہیں کب کیسے کس نے انھیں چھڑایا۔۔۔غبارے والا گالیاں بکتا اپنے بکھرے غبارے سمیٹ رہا تھا۔۔۔اور اَچھا بلکتی خیرو کو گود میں سمیٹے، خود کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ''کیا میں اور دادا ساری زندگی کچرا کریدتے، چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لئے ترستے یونہی مرجائیں گے۔۔؟ خیرو یونہی کانی، لنگڑی گڑیاں جمع کرتی رہے گی۔۔۔اس کی قسمت میں کیا کبھی کوئی نئی چیز نہیں لکھی جائے گی۔۔؟

اَچھے کو دادا کے گھسے پٹے جملے یاد آئے ''میں اور تیرا ابّا۔۔۔ہم سب ایسا ہی سوچتے اور بولتے رہے۔۔مگر کچھ نہیں بدلا۔۔کچھ نہیں بدلے گا۔۔لوگ کچرا باہر پھینکتے ہیں۔۔کچرا چننے والے کچرے سے بھی زیادہ بدبودار ہوتے ہیں۔۔''

مگر کیوں۔۔کیوں ہے ایسا۔۔۔؟ اچھا چلّا اُٹھا۔۔۔خیرو گھبرا گئی۔

''اَچھے تم امی ابو سے شکایت کر رہے تھے غبارے والے کی۔۔۔؟''

اَچھا تلخی سے بولا ''پوچھ رہا تھا۔۔۔کچرا اُٹھانے والے، اپنے جیسے مزید کیوں پیدا کر جاتے ہیں۔۔۔''

خیرو کچھ سمجھی یا نہیں مگر دُور سے آتے دادا کو دیکھ کر پکارنے لگی۔

''دادا۔۔۔دادا۔۔۔اَچھے کی غبارے والے سے لڑائی ہوگئی ہے۔۔''

بوڑھے دادا کے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے۔۔۔

ساری کتھا سننے کے بعد، دادا نے اپنا تھیلا اُٹھاتے ہوئے صرف اتنا کہا ''آئندہ نہ بھڑنا ایسے۔۔۔اندر ہو گیا تو ساری زندگی جیل میں لڑتا رہے گا''

''اچھا ہے وہاں کچرا ہو گا نہ کچرے کی بو۔۔'' اَچھا جھنجھلا کر بولا؛

''کچرے کی بھی قسمیں ہوتی ہیں پُتر۔۔۔نہ نظر آنے والا کچرا زیادہ بدبودار ہوتا ہے۔۔۔'' دادا کے لہجے کا عجیب سا تاثر اَچھے کو چونکا گیا۔

خیرو نے چلتے چلتے اَچھے کا ہاتھ حسبِ عادت پکڑا مگر چھوڑ دیا۔

''درد ہو رہا ہے نا!۔۔۔میں اب لال غبارہ نہیں مانگوں گی۔۔'' اچھے کا دل شدتِ غم سے پھٹنے لگا۔۔اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ دنیا سے کچروں کے ڈھیروں سے۔۔کیسے اور کیا انتقام لے۔۔وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کی رات کے دامن میں اس کے لئے کیا ہے۔۔کچرے کے علاوہ۔۔۔''

لیکن اس رات کسی چور اُچکے یا خرکار کے قدموں کے نشان اپنی دہلیز تک دیکھ کر اچھے کی سوچوں کا رخ یکا یک پلٹ گیا۔۔۔اسے خیرو کی فکر ستانے لگی تھی۔۔اسے احساس ہوا کہ کچرے میں بھی کچھ قیمتی اشیاء چھپی ہوتی ہیں۔۔

اگلے دن اَچھا، گاڑیاں صاف کرنے کے کام میں جُتا ہوا تھا۔ اُس نے رات ہی دادا کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اسے زیبو کا قصہ یاد تھا۔۔جسے کوئی کچی بستی سے اُٹھا لے گیا تھا کچھ ماہ پہلے ہی۔۔چند دن بعد نالے سے کچلی ہوئی لاش ملی تھی اس کی۔۔

اَچھا جلد از جلد بہت ساری گاڑیاں صاف کر کے اتنی رقم جمع کرنا چاہتا تھا جس سے وہ ایک پکا کمرہ کرائے پر لے سکے۔۔جس کا مضبوط لوہے کا دروازہ ہو۔۔کنڈی والا۔۔جس پر بڑا سا تالہ لگ سکے۔۔۔وہ خیرو کو کمرے سے، خرکاروں سے، کسی برے انجام سے بچانا چاہتا تھا۔۔کسی بھی طرح۔۔!

اس کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔۔دن بھر کاریں صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ اور جسم شل ہو جاتے۔۔رات کو بھی وہ اس ڈر سے کہ نیند نہ آ جائے۔۔اکڑوں بیٹھا رہتا۔۔بار بار اونگھتا پھر چونک کر خیرو کو دیکھتا تھپکتا۔۔۔

آنکھیں جلنے لگتیں تو پانی کے چھینٹے مارتا۔۔دادا اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتا۔۔۔ اسے سونے کا کہتا کہ وہ جاگ لے گا۔۔۔مگر اَچھے کو دادا کے بڑھاپے پر بھروسہ نہ تھا۔۔۔وہ خیرو کے معاملے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔

خیرو بے خبر پڑی سوتی رہتی۔۔اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ لال غبارے نے اَچھے کی آنکھوں میں کیسا لال غبار بھر دیا ہے۔۔وہ تو اب بھی لال گاڑیاں دیکھ کر مچل جاتی۔۔جانے اسے لال رنگ کیوں پسند تھا؟۔۔۔شاید سپنے لہو رنگ ہو جائیں تو لال رنگ آنکھوں میں بس جاتا ہے۔۔؟

لال غبارے خریدنے سے لے کر لال گاڑی میں بیٹھنے تک کی خواہش آخر خیرو کو اَچھے کے ''خزانے'' تک لے آئی۔۔اس نے وہ ڈبہ ڈھونڈ نکالا، جس میں قطرہ قطرہ پسینہ جمع ہو رہا تھا۔

ڈبے کا ڈھکن کھلتے ہی بھوری آنکھوں میں چمک لہرائی۔۔

''دادا، دادا۔۔اَچھے کے پاس کتنے سارے پیسے۔۔دادا دادا اب ہم لال گاڑی لیں گے نا۔۔۔''

اَچھا ہنسنے لگا۔''بھتنی اِن پیسوں سے گاڑی آتی ہے بھلا؟

خیرو نے ڈبہ فرش پر اُلٹ دیا۔ سکّے فرش پر پھیل گئے۔

''دیکھو کتنے سارے پیسے ہیں۔۔ہیں نا دادا۔۔۔دو گاڑیاں لیں گے۔۔۔''

خیرو نے بڑے یقین کے ساتھ دادا سے گواہی مانگی۔۔دادا اِدھر اُدھر کبھی نہ ملنے والی کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔اس کی آنکھوں میں بھی ایسے وقت کوئی تنکا ضرور پڑ جاتا تھا۔سو وہ آنکھیں ملنے لگا۔اَچھا رقم سمیٹ کر ڈبے میں ڈالنے لگا۔

''مجھے ان پیسوں سے اچھا سا کمرہ لینا ہے جہاں تجھے کالے چوروں سے بچا

سکوں۔۔''

لیکن خیرو کی ضد قائم رہی۔۔اسے ان پیسوں سے دو لال کاریں چاہئیں تھیں اور سکول بھی جانا تھا۔۔وہ ضد کرتی، منہ بسورتی سو گئی۔۔اَچھے کی آنکھوں میں پھر لال غبار بھرنے لگا۔

گاڑیاں صاف کرتے، خیرو کو بہلاتے جانے کتنے مہینے گزر گئے۔۔۔

اَچھے کو بس اتنا یاد تھا کہ سردی میں ٹھنڈے پانی سے گاڑیاں دُھوتے دُھوتے اُس کے شل ہاتھوں میں اس وقت بجلیاں بھر جاتیں جب کوئی لال گاڑی قریب رُکتی۔۔اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ لال گاڑی کو ضرور دُھوئے۔۔اجازت ملنے پر وہ اسے پاگلوں کی طرح شیشے جیسا چمکانے لگتا۔۔مشین بن جاتے اس کے ہاتھ۔۔۔اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔۔خیرو فٹ پاتھ پر بیٹھی۔۔ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔۔اَچھے کے پاس ایک نئی نکور لشکتی مسکتی لال کار آن رُکی۔۔یہ لمبی سی۔۔چم چم کرتی۔۔اچھے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔ایسی لال گاڑی اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔۔۔عجیب سی چھب تھی اس کی۔۔وہ اچھے کو آنکھیں مارنے لگی، مسکرا مسکرا کر اپنی جانب بلانے لگی۔۔لال غبار گہرا ہونے لگا۔۔اچھا گاڑی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے یہ کوئی جیتی جاگتی چیز ہو۔گاڑی کا مالک دکان میں جا چکا تھا۔۔اَچھے کو گاڑی کے شیشوں میں گاڑی کے بدن میں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔۔میلا کچیلا۔۔کچرہ زدہ۔۔ اچھا گھبرا گیا۔۔بے دھیانی میں اس کا ہاتھ ہینڈل پر پڑا تو دروازہ کھل گیا۔۔یوں جیسے اَچھے نے ''کھل جا سم سم پڑھا ہو۔۔'' مالک گاڑی کھلی چھوڑ گیا تھا۔۔اَچھے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔۔

وہ کہیں آگے بڑھ گیا تھا شاید۔۔۔اَچھے نے خیرو کو آواز دی وہ کھلونے سنبھالتی

قریب آ گئی۔۔گاڑی پر نظر پڑتے ہی چلائی۔۔

’’لال گاڑی لے آیا اَچھا۔۔آہا آہا۔۔‘‘

اَچھے نے جلدی سے خیرو کے منہ پر ہاتھ رکھا۔۔اِدھر اُدھر دیکھا اور اُسے گاڑی میں بٹھا دیا۔۔

’’لے بیٹھ جا۔۔اُس کا لہجہ گھمبیر سا ہو چلا تھا۔۔

خیرو اُچک کر سفید جھاگ میں دھنس گئی۔۔خوشبودار گاڑی نے اُس پر سحر پھونک دیا تھا۔۔اسے خبر ہی نہ ہو سکی، اچھا کب چپکے سے گاڑی کا دروازہ بند کر کے۔۔۔اس کے لیے کسی نامعلوم دُنیا کا دروازہ کھول گیا تھا۔۔۔

گاڑی کی مخالف سمت میں تیزی سے بھاگتے ہوئے، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اَچھا سوچ رہا تھا کہ گاڑی کا مالک رحم دل آدمی لگتا تھا۔۔خیرو کو کچرے کے ڈھیر سے دُور بھیجنے کا یہی ایک طریقہ اُسے سمجھ میں آیا تھا۔۔۔کیونکہ اس نے ابھی صرف کچرے کے وہی ڈرم اور ڈھیر دیکھے تھے جو بدبودار تھے۔۔خوشبودار کچرے سے اُس کا ابھی کہاں واسطہ پڑا تھا۔۔۔؟

☆☆☆

موتی مچھلی اور جل پری

چانڈیو نے جال کو جھٹکے دیتے ہوئے سمیٹنا شروع کیا تو پہلی بار اپنے بازوؤں کی طاقت پر اس کا ایمان متزلزل ہوا۔جال کے ساتھ ہی اس کے یقین کو بھی ایک شدید جھٹکا سا لگا۔

چانڈیو نے ماتھے سے سرکتی پسینے کی بوندوں کے عقب سے آسمان سے سرک کر سمندر کے پیٹ میں اُترتے سورج کو دیکھا۔ وہ چانڈیو کے پسینے کے ایک قطرے سے بھی چھوٹا تھا اس وقت!

چانڈیو تمام عمر اس گتھی کو نہ سلجھا پایا تھا کہ دن بھر اپنی تمازت سے دنیا بھر کو جلانے والا سورج شام ہوتے ہی کس طرح چند ہی لمحوں میں سمندر کے بطن میں یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے آسماں بھر کی مسافت کا مقصد زمین کے ایک شوریدہ حصے کے لیے سپردگی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ سوچتے سوچتے چانڈیو کے بازوؤں کی طاقت چند لمحوں کے لیے دوبارہ عود کر آئی، لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر کہ ماروی تو اب دنیا میں ہے ہی نہیں، چانڈیو کے عضلات پھر ڈھیلے پڑ گئے۔اس نے جال کو ڈھیلا کر دیا اور دُور پانی میں کھڑے اپنے ساتھیوں کو دیکھا جو بھاری جال کو دھیرے دھیرے دھکیل کر کنارے کی جانب لا رہے تھے۔۔دمکتے سنولائے چہروں پر تن کا یہ بوجھ۔۔۔من کو ہلکا پھلکا کر رہا تھا

کہ آج سب کا حصہ بھاری ہے۔۔۔تبھی چانڈیو کو وارث کا خیال آیا۔اس نے جلدی سے مُڑ کر دیکھا۔۔اُس کا پوتا وارث۔۔ریت سے اَٹے گھنگھریالے بالوں کو ہوا کی شرارتوں سے بچاتا۔۔۔ریت پر قدموں کے نشان بناتا۔۔اِدھر اُدھر سیپیاں چنتا پھر رہا تھا۔۔۔چانڈیو نے آواز دی؛

''وارث۔۔۔آجاؤ اب مچھلیاں ٹوکری میں ڈالنی ہیں'' چانڈیو جانتا تھا کہ مچھلیاں ٹوکری میں ڈالنے کا مرحلہ وارث کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔وہ عجیب طرح کے ترحم۔۔۔تجسس،خوشی اور غم کے رنگ لیے اپنی سیاہ چمکتی آنکھوں سے اس سارے منظر کو دیکھتے دیکھتے کہیں کھو جایا کرتا تھا۔

وارث نے جلدی سے کچھ سیپیاں ایک جانب سے پھٹی ہوئی اور مایوسی سے لٹکی ہوئی جیب میں ڈالیں۔اور دادا کی جانب بھاگ کھڑا ہوا کہ سمندر سے نکل کر ایک ٹوکری میں محدود کر دی جانے والی چھوٹی بڑی مچھلیوں کا جاندار احتجاج، بے جان سیپیوں کی نسبت بہر حال زیادہ بھرپور نظارہ تھا۔

چانڈیو کے ساتھی دھیرے دھیرے جال کا دائرہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔ ساحل کے قریب ریت پر دم توڑتی لہروں میں جال کے تاروں میں پھنسی مچھلیوں کے تڑپنے اور اُچھلنے کے ساتھ ساتھ وارث کا دل بھی اسی رفتار سے تڑپ اور اُچھل رہا تھا۔

چمکتی پھسلتی،ہانپتی۔۔۔چھوٹی بڑی ڈھیروں مچھلیاں سمندر میں واپسی کے لیے اپنا آخری زور لگا رہی تھی۔۔کئی مچھلیاں جن کی چھلانگ زوردار تھی۔۔یا قدرے چھوٹی تھیں اُچھل کر جال کے سوراخوں سے پھسل کر غڑاپ سے دوبارہ پانی میں کود پڑی تھیں۔۔۔چند شکست خوردہ لہریں انھیں ساتھ لے جا رہی تھیں۔انھیں واپس تیزی سے سمندر میں غائب ہوتے دیکھ کر وارث کے دل سے ہمیشہ خاموشی سے یہ دعا نکلتی۔''یا اللہ یہ ساری مچھلیاں بھاگ جائیں تو کتنا اچھا ہو۔۔'' کیوں کہ اُس کی دُعا

دادا کے اُصولوں۔۔۔دادا کے مفادات کے خلاف تھی۔اس میں سے بغاوت کی بُو آتی تھی۔ویسے بھی دادا اور پوتا کے مفاد الگ الگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔۔۔اصل مسئلہ وارث کا تھا کہ اسے۔۔۔survival of the fittest کے قانون کی شُد بُد نہ ہونے کے علاوہ محبت،رحم۔۔۔ترس ایسے متروک الفاظ بھی ابھی تک اس کی ننھی سی دنیا میں موجود تھے۔

جال دھیرے دھیرے ساحل پر سمٹتا گیا۔۔۔مچھلیوں کا ڈھیر۔۔۔اور اونچا۔۔۔اور قریب ہوتا گیا۔وارث نجانے کیوں چند قدم پیچھے ہو گیا۔۔۔ریت پر اُچھلتی پھسلتی دم توڑتی مچھلیوں کو وارث بغیر پلک جھپکائے دیکھتا رہا۔۔۔پھر اس نے سہم کر دادا کا کُرتا یوں پکڑ کر ہلایا۔۔جیسے مچھلیوں کی خوف سے پھیلی پتلیوں میں جم جانے والی موت کا ذمہ دار وہ خود ہو۔۔وارث نے لرزتے لہجے میں پوچھا۔

''بابا یہ اتنی ساری مچھلیاں اپنے گھر والوں سے دُور مرتے وقت روتی ہیں نا۔۔۔''

چانڈیو نے اپنی کمر کے ساتھ لگے ریت بھرے گھنگھریالے بالوں کے ذرا نیچے سہمی سی چمکتی آنکھوں کو دیکھا۔۔جن میں مردہ مچھلیوں کے عکس جھلملا رہے تھے۔۔چانڈیو نے اس کے بالوں کو پیار بھرا جھٹکا دے کر کہا؛

''حلال چیز کا دُکھ فضول ہے بیٹا۔ہم شکار نہیں کریں گے تو بڑی مچھلیاں کھا جائیں گی انھیں۔۔۔''

وارث نے ایک گہری سانس لے کر اپنی لٹکی ہوئی جیب میں پڑی چند سیپیوں کو تھپک کر محسوس کیا اور سنہری ڈھیر کو دیکھا۔۔۔جس پر تاریک سائے رینگنے لگے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ہلکی سے تڑپ کی لہر اُٹھتی پھر ٹھنڈی ہو جاتی۔۔

''بزدل۔۔۔بھلا سمندر کی مخلوق کو ریت پر لا کر بے بس کرنا کون سا کارنامہ ہے۔۔۔؟''

لیکن وارث صرف سوچ سکتا تھا، کہنا اس کے بس میں نہیں تھا۔۔جال سمٹ چکا تھا۔۔سارے شکاری اپنی اپنی ٹوکریاں بھر رہے تھے۔ان کے ہاتھ پاؤں تیزی سے مصروفِ کار تھے۔وارث کا جی ڈوب سا گیا وہ پھر سیپیاں گھونگے چننے لگا۔

وہ ہر روز عہد کرتا کہ دادا کے ساتھ مچھلیوں کی بے بسی کا یہ تماشا دیکھنے نہیں آئے گا۔لیکن خود بخود اس کے قدم گیلی ریت پر دادا کے قدموں کا پیچھا کرنے لگتے۔

سورج اپنی حدت سمیت سمندر میں غرق ہو چکا تھا۔۔چانڈیو نے وارث کو آواز دی۔

''وارث بیٹا۔۔۔اُٹھو۔چلیں تمہاری ماں پریشان ہوگی''

وارث نے اُٹھ کر ریت کے چہرے پر ایک ٹھوکر ماری شاید تڑپتی دم توڑتی مچھلیوں کا انتقام لینے کو۔۔۔پھر کسی قدر جھنجھلا کر آنکھوں میں آئی مایوسی کو آستین سے پونچھتے ہوئے۔۔دادا کو دیکھ کر ''مجھے موتی والی سیپی کیوں نہیں ملتی۔۔۔ہاں؟''

چانڈیو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔۔۔بالکل ویسا ہی قہقہہ جیسا اس کے دادا نے اس کے باپ کے سامنے لگایا تھا اور اس کے باپ نے خود چانڈیو کے سامنے۔۔۔ایسے ہی ایک سوال پر۔۔۔اور سالوں بعد پھر ایسا ہی ایک قہقہہ وارث لگائے گا اور پھر وارث کا بیٹا۔۔۔پھر اس کا پوتا۔۔کیوں کہ وہ بھی جانتے تھے۔۔چانڈیو بھی جانتا ہے اور وارث بھی جان جائے گا کہ موتیوں والی سیپیاں، سیپیاں چننے والوں کے مقدر میں شاذونادر ہی ہوتی ہیں۔لیکن پھر بھی وارث کی تسلی کے لیے اس نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

''مل جائے گی۔۔۔مل جائے گی ڈھونڈتا رہا۔۔۔''

مگر وارث کی تشفی ایک ہی سوال و جواب میں کہاں ہوتی تھی، وہ تو سوال پہ سوال کیے جاتا تھا۔۔شاید مچھلیوں کے اُچھلنے کودنے سے ان کے ساکت ہو جانے تک۔۔۔منظر کو بھلانے کے لیے۔۔۔وہ پھر بولا۔

''بابا۔۔۔تمہیں کبھی کوئی موتی ملا۔۔۔۔؟''

چانڈیو نے مچھلیوں سے بھری ٹوکری ایک کاندھے سے دوسرے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔''

وارث کی سانس جیسے رک گئی، اس کے قدموں کے ساتھ ہی۔۔۔سمندر، آسمان، سورج، پرندے۔۔۔سب ساکت ہو گئے۔۔۔ٹوکری میں پڑی مچھلیوں کی طرح۔۔چند لمحوں بعد اس کے لب پھڑ پھڑائے۔۔۔ڈھیر میں ایک نیم جاں چھوٹی سی مچھلی تڑپی۔۔۔

''کہاں۔۔۔ہے۔۔وہ موتی؟''

الفاظ تحیر کی چٹان سے اٹک اٹک کر سنبھل سنبھل کر اُترے۔۔۔چانڈیو کے زوردار قہقہے نے تحیر کی چٹان کو پاش پاش کر دیا۔الفاظ بکھر گئے۔۔۔

''تو ہے نا میرا موتی۔۔۔''

وارث مایوسی کی ریت پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔۔۔اُس نے مڑ کر دیکھا۔۔۔سورج راکھ ہو چکا تھا۔سمندر دھواں دھواں سا اور پرندوں کے پَر رات کے جال میں اُلجھتے جا رہے تھے۔۔۔صرف شوریدہ لہروں کا شور باقی تھا۔۔۔

چانڈیو کے قدم جھونپڑی کے قریب آن کر تیز ہو گئے۔اندر سے لالٹین کی روشنی

ڈر ڈر کر اندھیرے میں جھانک رہی تھی۔ جھونپڑی میں اساوری۔۔روشنی اور اندھیرے کے وجود سے بے خبر ٹٹول کر اپنا بستر چٹائی پر بچھاتے ہوئے ماں سے وارث کے بارے میں کہہ رہی تھی کہ اسے آج لگتا ہے دیر ہوگئی ہے۔ اساوری کو معلوم تھا کہ وارث مچھلیاں دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے روز موتی بھی ڈھونڈنے جاتا ہے۔ اسے وہ کہانی یاد آ گئی، جو اساوری نے ایک دن وارث کو سنائی تھی۔ ایک اندھی جل پری کی کہانی۔ جو اپنی سنہری زلفوں، نیلگوں آنکھوں جیسے سمندر میں تیرتے تیرتے ایک ایسا موتی تلاش کر لائی تھا جس سے جل پری کی آنکھوں کے چراغ روشن ہوگئے تھے۔۔

لیکن وارث کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اساوری نہ تو سنہری زلفوں والی جل پری تھی اور نہ ہی کوئی آدم زاد اس کی بے رنگ آنکھوں میں ڈوبنے کو تیار تھا۔۔۔اس نے تو جل پری کی کہانی اپنے چھ سالہ بھائی وارث کو سنائی تھی۔ جو پاگل تھا بالکل۔۔۔روز کہانی والا موتی ڈھونڈنے جاتا اور آنکھوں میں ریت بھر لاتا۔ ریت آنکھوں میں چبھتی تو کئی موتی لڑھک آتے۔۔۔مگر یہ موتی تو بہہ جانے والے تھے۔قمیض کی گندی آستین، پھٹے دامن یا مٹی میں جذب ہو جانے والے۔۔۔اِن سے بھلا آنکھیں روشن ہوتی ہیں کسی کی!۔۔۔

روز رات کو اساوری وارث کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، دبا کر گرم کرتی، اس کے ٹھٹھرتے لہجے کو اُمید کی لَو دیتی۔۔روز صبح سورج۔۔۔تمازت لیے آسمان پر چڑھائی کرتا اور شام کو سمندر کے بطن میں اُتر جاتا۔۔۔ چانڈیو روز جال لگاتا۔۔۔مچھلیاں تڑپتی اور ٹھنڈی ہو جاتیں۔۔۔ چانڈیو تقدیر کے جال سے نہ نکل سکا نہ ٹھنڈا ہو سکا۔۔۔اسے اس جال کے ایک سرے سے دوسرے سرے پھر

تیسرے پھر چوتھے سرے تک چلتے رہنا تھا۔ پھسلتے رہنا تھا۔۔۔یہاں تک کہ ایک دن وہ خود جال میں اَٹک جائے گا۔۔۔یا انتظار کرنا تھا وارث کی جوانی تک۔۔۔جب وارث سمندر کے مزاج کو جان کر۔۔۔اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے سینے پر پاؤں گاڑ کر اپنے باپ کا حساب مانگے گا۔۔۔وارث کا باپ امن چانڈیو بھی تو سمندر کا مزاج جانتا تھا۔۔۔عمر گزاری اس نے سمندر سے لڑتے لڑتے۔۔۔مگر ایک دن سمندر کا غصہ اسے کھا گیا۔۔اسے بھی مچھلیوں سے زیادہ موتیوں کی تلاش رہتی تھی۔۔بالکل اپنے بیٹے کی طرح۔۔۔

وارث بھی دن رات دادا سے یہی ضد کرتا تھا کہ وہ بھی دُور گہرے سمندر میں جائے گا۔۔۔

دادا کے ساتھ۔۔جہاں تہہ میں بے شمار چمکدار موتی ہیں۔۔۔لیکن دادا کہتا۔۔''ابھی تم بہت چھوٹے ہو اور سمندر بہت بڑا۔۔''

وارث اس سے لڑ پڑتا تھا ''دادا تم بھی سمندر سے بہت چھوٹے ہو۔۔۔پھر تم کیوں جاتے ہو گہرے پانیوں میں۔۔'' مگر وارث کے ان پاگل سوالوں کا جواب ۔۔۔کچھ نہ تھا۔۔''

پھر ایک رات جب سمندر بہت غصے میں تھا۔۔۔اس کے منہ سے جھاگ اُبل رہا تھا۔ وارث کا دادا گہرے پانیوں میں چلا گیا۔۔۔کیوں کہ حکیموں نے کہہ دیا تھا کہ اساوری کے پیٹ کے درد کا علاج ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ بڑے ہسپتال میں جہاں ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں۔۔

چٹائی پر پڑی تڑپتی سسکتی بے نور آنکھوں سے نیر بہاتی اساوری کے آنسو۔۔۔ماں کے خون میں اس کی رگوں میں اُبل رہے تھے۔ وارث بے حس و

حرکت تھا۔ اساوری اسے جال میں پھنسی ریت پر پھڑکتی تڑپتی۔۔۔مچھلی نظر آ رہی تھی۔ یوں جیسے ابھی چند لمحے بعد پھر وہ ساکت ہو جائے گی۔ کسی ٹوکری میں ڈال دی جائے گی۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔

وارث ایک دَم اُٹھا اور جھونپڑی سے باہر بھاگ گیا۔۔۔ہولناک رات میں ایک بھربھری سی چٹان پر سسکتی ہواؤں کے بین۔۔۔اور بلکتی لہروں کی جھنجھلاہٹ نے خوف کو اس مقام پر لا کر چھوڑ دیا جہاں سے بے حسی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

رات کے کسی پہر۔۔۔خوف نے وارث کے بے حس بدن کو آ دبوچا۔۔۔ جھونپڑی سے ماں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بین کر رہی تھی۔۔اساوری کی چٹائی پر لیٹ کر رونے لگتی تھی۔۔۔

بستی والے مچھلیاں لے کر آئے۔ لٹکتی بے جان مردہ مچھلیاں دیکھ کر ایک رات جب وارث کا جی متلانے لگا تو وہ دُور کہیں چٹانوں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔

ایک رات جب وارث نیم غنودگی میں تھا۔۔۔دادا آ گیا، اور وہ دادا کی سسکیاں سن کر بھی چُپکا پڑا رہا کہ آنکھ کھلتے ہیں کہیں دادا اور اماں بھی کسی تڑپتی مچھلی میں نہ تبدیل ہو جائیں۔۔۔

دادا کی آواز پُر شور تھی۔ وارث خاموش ہو گیا۔ وہ دادا کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ جل پری والی کہانی میں اساوری نے یہ بھی بتایا تھا کہ شادی سے پہلے مر جانے والی لڑکیاں جل پریاں بن کر سمندر کی تہہ میں رہنے لگتی ہیں۔۔۔وارث کو اساوری کی ہر بات پر یقین تھا کیوں کہ اساوری کو وہ سب کچھ دِکھتا اور سنتا تھا جو دادا اور ماں نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے۔۔

وارث اب بھی دادا کے ساتھ اس کے قدموں کے نشان پر گیلی ریت میں قدم

رکھتا چلتا تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھیں تڑپتی۔۔۔ساکت ہوتی مچھلیوں کے نظارے پر خاموش رہتی تھیں۔۔۔چُپ۔۔۔چُپ۔۔۔گہری چُپ لیے۔۔۔

دادا کے بچھائے جال کو دیکھتے دیکھتے وہ سمندر کی تہہ میں تیرنے لگتا۔ تبھی ایک رات ماں نے چانڈیو سے کہا ''بابا وارث بہت بدل گیا ہے۔۔۔'' دادا نے سوئے وارث کے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔

''اساوری کی موت کا یقین نہیں آیا اسے ابھی تک۔۔۔''

ماں نے ہوا سے مشابہہ سسکی بھری

''مجھے خوف آنے لگا ہے بابا۔ خاموش گہرا سمندر اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔''

دادا نے اس سوال کے خوفناک جواب سے بچنے کے لیے چٹائی پر لیٹ کر گدڑی سر سے پاؤں تک تان لی۔ چند لمحے گدڑی لرزتی رہی۔۔۔پھر بوڑھے کی آواز لرزی۔۔۔

''سمندر سے لڑنے والوں کے دل بھی سمندر ہو جاتے ہیں۔۔۔گہرے اندھیرے اور شوریلے۔۔۔''

ماں نے خوف زدہ ہو کر وارث کو دیکھا، پھر گھبرا کر نظریں پرے کر لیں۔ اسے یوں لگا وارث کی چٹائی پر سمندر بہہ رہا ہو۔۔۔اندھیرا۔ شوریلا۔۔۔

صبح پوری بستی میں چانڈیو اور اس کی بہو۔۔۔وارث کو ڈھونڈ رہے تھے۔

کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا، زمین کے تینوں کنارے اس کے وجود سے عاری تھے۔ ہاں چوتھا کنارا سمندر کچھ جانتا تھا۔۔۔مگر آج کتنا پُرسکون، کتنا خاموش تھا۔۔اپنے خزانوں میں ایک اور موتی کو چھپا کر۔۔۔

☆☆☆

بیل کی کہانی

خوبصورت منقش گملے میں لہراتا ننھا سا خوش نما پودا نوجوانوں کی خاص طور پر دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اماں بی اور دادا ابو نے غور سے پودے کو چھو کر سونگھ کر اگرچہ اس کے رنگ ونسل کے بارے میں شکوک کا اظہار بھی کیا تھا، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے چمکیلے پتے اور جھومر جیسے جھولتے ننھے ننھے پھول اُنھیں بھی لبھا رہے تھے۔

''دادا ابو نرسری والا بتا رہا تھا یہ بیل بڑی تیزی سے پھیلتی ہے'' قندیل خاصی exited تھی۔

تبھی عامر نے مستقبل کی تصویر کشی شروع کر دی'' گھر کی دیواروں اور چھت پر جب یہ بہار دکھائے گی تو گزرنے والے مڑ مڑ کر دیکھیں گے''۔

''کیوں'' دادا ابا نے عینک اُتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ پھر اماں بی کی جانب متوجہ ہوئے۔

''کیوں بہو ہے تو خوبصورت یہ بیل مگر باس دل کو نہیں بھا رہی۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔؟''

اماں بی نے سر سے سرکتے ڈوپٹے کو دوبارہ سلیقے سے سجاتے ہوئے سسر اور بچوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح پل کا کردار کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''اصل میں بچے گھر کی Looks میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ دیواروں پر لگا سیمنٹ پتھر رنگ وروغن اچھا تو تھا مگر تقریباً سبھی گھر اس علاقے میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ایک ہی جیسے لگتے تھے۔ سو انھوں نے لان کو نئے سرے سے نئے انداز سے سنوارنے کا سوچا۔ ساتھ ہی دیواروں اور چھت پر خوبصورت بیلوں کو چڑھانے کا خیال بھی سوجھا۔

قندیل اور عامر کو کئی نرسریاں چھاننے کے بعد ایک نرسری سے یہ بیل ملی تھی۔ جس کے پھول بھی خوبصورت تھے اور جو بقول نرسری والے کے بانس کی طرح راتوں رات بڑھتی تھی۔۔۔ سو ماں کا بیان مکمل ہوتے ہی انھوں نے پھرتی سے گملا اُٹھایا اور لان میں پہنچ گئے۔۔

دادا ابا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے برآمدے میں پڑے موڑھے پر بیٹھ گئے اور لگے حقّہ گڑگڑانے۔۔۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی کسی مسئلے کا سرا ہاتھ نہ آتا۔۔۔ اندر سے پوری طرح ''ہاں'' کی آواز سنائی نہ دیتی تو حقّے کی گڑگڑاہٹ میں ذہن کے اُبال کو سمونے کی کوشش کرتے۔۔۔ اندر کے الاؤ کا حقّے کے دھوئیں سے کیا مقابلہ!۔۔

یہ کوشش ناکام ہونے پر ٹھنڈے پانی سے غسل کا استعمال کرتے۔

بیل نے دیکھتے ہی دیکھتے اطراف کی دیواروں کو ڈھکنا شروع کر دیا۔ سبھی خوش تھے۔ سیمنٹ اور پتھروں کے کھردرے پن کی جگہ اب سبزے کے ساتھ لال نیلے سفید پھولوں نے لے لی تھی۔ گھر کی Looks میں واضح فرق محسوس ہونے لگا تھا۔۔۔ باقی تو سب ٹھیک تھا۔۔ لیکن دادا ابو اور اماں کو بیل کے قریب سے کبھی کبھار ایک ہمک یا باس کا جھونکا سا آتا محسوس ہوتا۔ جو بقول بچوں کے ان کا وہم تھا۔۔ البتہ

اس بیل کی خوشبو بھی کوئی نہ تھی۔مگر خوشنمائی اور چمکیلے پتوں کے ہوتے ہوئے خوشبو کا عنصر اتنا اہم نہ رہا تھا۔ ویسے بھی بدن پر مہکتے پرفیومز۔۔۔کمروں میں گھر میں ہر طرف Airfreshner کے ہوتے ہوئے پھولوں کی خوشبو کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ بیل مختلف دیواروں کا احاطہ کرتی ہوئی اب سامنے گیٹ کے ساتھ چھت کی جانب بڑھ رہی تھی۔۔۔دُور سے یہ گھر۔۔باقی گھروں کی نسبت خاصا مختلف اور خوبصورت دکھائی دینے لگا تھا۔ بچے خوش تھے۔

خرابی اس دن پیدا ہوئی جس دن نماز پڑھتے ہوئے پٹ سے بیل کے پتوں سے ایک سیاہ سانپ نما کیڑا گرا اور اماں بی کے ڈوپٹے پر رینگنے لگا۔گھبرا کر انھوں نے نماز توڑ ڈالی۔ یہ اچھا شگون نہ تھا۔کیڑے کو گھبرا کر جھٹکا تو وہ تیزی سے رینگتا ہوا پھر بیل میں جا چھپا۔

زندگی میں پہلی بار ان کی نماز میں خلل پڑا تھا۔جس کا انھیں بے حد قلق تھا۔دادا ابو نے بیل کو کھنگالنا شروع کیا تو عجیب وغریب انکشافات ہونے لگے۔

دُور سے خوشنما اور چمکیلے دکھائی دینے والے پتوں اور ملائم سفید نیلے پھولوں سے ڈھکی شاخوں پر سانپ نما کیڑے شاخوں کا حصہ بنے چمٹے ہوئے تھے۔اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ پوری بیل میں ان کیڑوں کی تعداد نہ جانے کتنی ہو گی۔ جب کہ یہ بیل پورے گھر کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ یہ خیال خاصا کراہت آمیز تھا۔ بلکہ شاخوں کی چمکتی تہوں میں ایک خاص قسم کی سڑاند بھی موجود تھی۔

دادا ابو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ کہ بیل کو ہٹانا ضروری ہے۔ مالی سے بات بھی کر لی گئی۔مگر قندیل اور عامر پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔نہیں دادا ابو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی بیل نے گھر کی Show بنا دی ہے اور آپ اسے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اماں آپ

سمجھائیں نا انھیں۔۔۔؟ اماں بے چاری اس مرحلے پر عجیب اُلجھن کا شکار ہو گئیں۔ کیوں کہ وہ خود زہریلے کیڑوں اور بدبو سے خوفزدہ تھی۔آنکھوں دیکھی مکھی کیسے نگل لیتیں۔مگر اُن کے دلائل بے کار گئے۔

بچوں کا موقف تھا کہ ہر پودے میں کیڑے مکوڑے سبھی کچھ ہوتا ہے اور پھر یہ تو Foreign plant ہے۔ ہزاروں قسم کی Allergies کے باوجود لوگوں نے لگائے ہوئے ہیں۔تب اماں بی نے بھی سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے اپنے دیسی پودوں، پھلدار درختوں اور جڑی بوٹیوں میں بھی کیڑے زہر سب کچھ ہوتا ہی ہے۔

دادا ابو مُصر تھے کہ خودرُو جنگلی پودوں کی بات اور ہے۔گھر میں نسبتاً محفوظ پھول پودے لگنے چاہئیں۔ایک سرد جنگ کی سی کیفیت گھر بھر پر چھا گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن عامر کو مالی نے بتایا کہ دیواروں کا سیمنٹ اور رنگ و روغن جگہ جگہ سے تیزی سے خراب ہو کر گر رہا ہے اور یہ ساری کارستانی اس بیل کی ہے جو اپنے خوش نما پتوں اور پھولوں کے جال تلے اپنے نوکیلے کانٹوں اور جڑوں سے سیمنٹ کو چاٹ رہی ہے۔

دادا ابو شد و مد کے ساتھ بیل کے مخالف ہوئے، اماں بی خاموش تھیں کہ اب مسئلہ گھر کی دیواروں اور چھت کا تھا اور خاصا اہم تھا۔

دادا ابو نے اپنے طور پر چھان بین شروع کر دی پتہ چلا کہ یہ بیل دریا پار والی حویلی سے لائی گئی تھی۔ جہاں ایک لمبا چوڑا گھرانہ آباد ہے۔ان کی خاصی جاگیر ہے اور مختلف علاقوں سے آ کر یہاں آباد ہو جانے والے ان گھرانوں نے آپس میں رشتے ناطے کر لیے اور ایک خاندان بنا کر اپنے علاقے میں دھاک بٹھا لی۔ایسی بیلیں وہی تمام نرسریوں کو بھیجتے اور بیچتے ہیں۔ دادا ابو کو سخت غصہ آیا کہ کیسے شر پسند لوگ ہیں جو ایسی زہریلی اور دیواروں کو کھوکھلا کرنے والی بیلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ ان کی

گوشمالی کرنا چاہتے تھے۔ مگر مالی نے سمجھایا کہ بڑے خرد ماغ لوگ ہیں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کا بس چلے تو پورے شہر کو اپنی حویلی میں ڈال لیں۔

اماں بی بھی خوفزدہ تھیں انھوں نے بھی اِدھر اُدھر سے سنا کہ دریا پار حویلی والے اپنے اور اپنی بیلوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ نہ جانے کس طرح اپنے متعلق شکوک ظاہر کرنے والوں کی انھیں خبر ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس گھر کے افراد میں پھوٹ ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنگن نفرتوں سے بھرتے اور محبتوں سے خالی ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ سُونے ہو جاتے ہیں۔

قندیل اور عامران باتوں کو محض وہم سمجھ کر ٹالتے رہے۔ بلکہ انھوں نے مالی کی بھی سرزنش کر ڈالی کہ وہ اُلٹی سیدھی افواہوں سے پرہیز کرے۔

لیکن دھیرے دھیرے ان پر بھی کچھ چیزیں عیاں ہونے لگیں۔ گھر میں داخل ہوتے وقت کھانا کھاتے کوئی اہم کام کرتے وقت یا باہر نکلتے وقت کوئی نہ کوئی سیاہ کیڑا سرسراتا ہوا قریب سے گزر جاتا۔ دونوں کے چہروں کا رنگ بدلنے لگتا۔

بے تحاشہ پرفیوم اور Airfreshner کے باوجود بھی عجیب سے سڑاند کا کوئی جھونکا گھر میں بار بار آتا محسوس ہوتا وہ گھبرا جاتے۔ کوئی ملنے جلنے والا بیل کی خوش نمائی کو سراہتا تو وہ غور سے اس کی ناک کو دیکھنے لگتے کہ کہیں ناگوار باس کے باعث وہ سکڑ تو نہیں رہی۔

دھیرے دھیرے بیل نہ صرف گھر کی دیواروں اور چھت کو بلکہ ان کی سوچوں اور ذہنوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگی ہر دم ان کے اعصاب پر سوار رہنے لگی۔

اماں بی کو اکثر کئی بار یوں لگتا جیسے بیل پر اُگی ہزاروں آنکھیں انھیں گھور رہی ہیں۔ بعض اوقات محسوس ہوتا کوئی ان کے قدموں کی چاپ بھی سن رہا ہے۔

وہ محتاط اندازے سے دبے پاؤں چلنے لگیں۔ ان کی حرکات وسکنات میں قدرتی پن مفقود ہونے لگا۔ خوفزدہ انداز میں نپے تلے کام کرتے کرتے ان کے اعصاب چٹخنے لگے۔ اس احساس کی تشہیر بچوں کے سامنے بے فائدہ تھی۔ سسر سے ہلکا تذکرہ کیا تو وہ چونک گئے۔ ان کی اپنی ذہنی کیفیت بھی یہی تھی۔ بہو کو مزید ہراساں کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے طور پر چپکے چپکے بیل کے پتوں اور شاخوں کی تلاشی لینے لگے۔ جیسے واقعی وہاں کوئی ذی روح بیٹھا اُن کی نگرانی کر رہا ہو۔

اِدھر بیل تھی کہ سیلِ رواں کی طرح بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ گیٹ، دیواریں، چھت، صحن، دالان، گرل، کھڑکیاں سبھی پر وہ گھوم رہی تھی، سرسرا رہی تھی۔ اس کی چمکتی شاخیں فتح کے نشے میں مست گھر کے کونوں کھدروں پر یلغار کیے جا رہی تھیں۔ کچھ شاخیں چھت سے ہو کر عقبی صحن، برآمدے کے ستونوں اور روشن دان کے ذریعے اندرونی چھت پر بھی رینگ آتی تھیں۔۔

اب قندیل بھی دل سے چاہنے لگی تھی کہ بیل اُکھاڑ دی جائے مگر پورے گھر پر اس کا وجود یوں طاری ہو چکا تھا کہ اس کے بغیر اب گھر کا تصور عجیب سا لگتا تھا۔

اگر بیل اُکھاڑ دی گئی تو جا بجا کھرونچوں سے اُکھڑا سیمنٹ اور رنگ و روغن کتنا برا لگے گا۔ دوسری کوئی بیل بڑھنے میں جانے کتنی مدت لے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی دیواروں اور چھتوں کو خراب کرے۔ کیڑے اور باس اس کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔

ڈھیروں تاویلیں، دلائل۔۔۔ قافلہ در قافلہ ان کی سوچوں کو آباد کرتے اور گزر جاتے۔ کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر کئی دوسرے گھروں میں بھی یہ بیل تھی۔ وہاں بھی تو ایسے پرابلمز ہوں گے۔ عامر سوچتا ''شاید ہم لوگ کچھ زیادہ وہمی اور Security Concious ہو گئے ہیں؟''

مگر اماں بی اب بضد تھیں کہ اس بیل کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی نا قابلِ قبول اور نقصان دہ بات جڑی ہے۔

دادا ابو اِسے اُکھاڑ پھینکنے کی تیاریوں میں تھے، مگر اب مالی ٹال مٹول کر رہا تھا۔ زہریلے کیڑوں سے بھری کئی سوفٹ پر پھیلی بدبودار بیل کو اُکھاڑنے سے وہ خود ڈر رہا تھا۔ وہ یہ کام کسی اور سے کروانا چاہتا تھا مگر جو بھی آ کر بیل کے حجم اور اس کے کیڑوں کو دیکھتا غائب ہو جاتا اور مڑ کر نہ آتا۔

رفتہ رفتہ چاروں کو پریشانی لاحق ہونے لگی کہ جلد از جلد منڈھے چڑھ جانے والی اس بیل کو اب اُتارا کیسے جائے؟۔

پودوں کے کیڑوں کے کئی ماہرین کو بلایا گیا۔ کسی نے کہا کہ بیل کو جڑ سے کاٹ دیں۔ شاخیں پتے خود مر جائیں گے، مگر جڑ کو کون کاٹے۔ کیڑے مار سپرے کا بھی مشورہ ہوا، لیکن سارے کیڑے ایک دم کیوں کر مریں گے۔ ادھ موئے ہو کر بھاگیں گے تو گھر پر دھاوا بول دیں گے۔ الماریوں بکسوں اور کونوں کھدروں میں جا چھپے تو کتنے دن مسئلہ رہے گا کہاں کہاں ڈھونڈیں گے انھیں۔ ویسے بھی پچھلے دنوں دادا ابو نے کچھ کیڑوں کو جب کچلا تھا تو برآمدے کے فرش پر ایسے بدنما دھبے پڑ گئے تھے کہ بار بار رگڑنے دھونے سے بھی وہ نشان مٹے نہیں بلکہ فرش کا وہ حصہ دھبوں کے باعث میلا میلا سا نظر آنے لگا تھا۔ محض ایک زہریلی بدبودار بیل کے باعث۔

وہ چاروں کبھی مل بیٹھ کر، کبھی الگ الگ اپنے اپنے طور پر دن رات اسی اُدھیڑ بُن میں تھے کہ کیا کریں اچانک عامر کو ایک انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے نوک پلک سنوار کر اسے سب کے سامنے پیش کر دیا۔

پہلے پہل تو دادا ابو، اماں بی اور قندیل اسے دیوانے کا خواب سمجھے۔ نا قابلِ

عمل۔۔۔ مگر جوں جوں غور کرتے گئے۔ توں توں گرہیں کھلتی گئیں۔

اگلے دن گھر کے باہر دادا ابو اور عامر کی نگرانی میں مٹی کے تیل کے کئی کنستر ایک جانب دھرے تھے اور دوسری جانب فائر بریگیڈ کا چوکس عملہ تیار کھڑا تھا۔ دور فاصلے پر کار میں بیٹھی ورد کرتی اماں بی سوچ رہی تھیں کہ اپنے ہاتھوں لگائی بدبودار بیلوں اور ان کے زہریلے کیڑوں کے خاتمے کے لیے اپنے ارد گرد آگ کبھی کبھار خود ہی لگانی پڑتی ہے۔

☆☆☆

جمعرات کی چادر

پتہ نہیں یہ سب کیسے ہوگیا۔ زمانہ کتنا ماڈرن ہوگیا ہے۔ بڑی احتیاط کی تھی۔ وہ جو طعنے دیتا تھا۔ تو کیسی دقیانوسی لڑکی ہے۔ ایف اے پاس ہوکر بھی یہ شرم وحیا کا چکر۔ کس دنیا میں رہتی ہے تو؟...... ارے آج کل تو یہ فیشن ہے دوستی کے نام پر۔ بھئی جب سب کچھ اپنا ہے جب چاہیں، جیسے چاہیں استعمال کریں۔ آنکھیں، ناک، منہ، ہاتھ پاؤں تو کیوں نہ...... روبی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور شوکت نے اس کے ہاتھ کو شدت جذبات سے کاٹ ڈالا تھا۔ ایسی ہی ''سی'' اس وقت بھی روبی کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔

پھر کچھ فلموں نے جذبات بھڑکانا شروع کر دیئے۔ کچھ محلے کی نئی نویلی دلہنوں کی بدلتی چالوں...... مٹکتی نظروں نے خواب دکھائے۔ پہلے تو چھتوں پر جانا، گلی میں ملنا، خط پتر اور پتھر کا پکڑا جانا۔ کئی خطرات تھے۔ اب تو ایک ننھا سا ڈبہ چاہے مٹھی میں چھپا لو...... پہلے جوتے میں ساری دیواریں، کوٹھے، حدیں پھلانگ جاتا ہے...... پھلانگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نہ بولنے کی ضرورت کہ کوئی سن لے۔ بس چند حروف اور ٹائم، وقت، جگہ سب مقرر ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی اب کون پوچھتا ہے۔ کون کہاں جا رہا ہے، کیوں جا رہا ہے...... ہاں اس کے محلے کے لوگ دقیانوسی تھے۔ زمانے کی ہوا سے

باخبر مگر اس سے بچنے کی کوشش میں مصروف...... تبھی تو پیچھے تھے زندگی کی دوڑ میں۔

شوکت نے روبی کے ذہن کے صحن کو نئی نئی، چمکیلی، لشکارے مارتی سوچوں سے بھر دیا تھا۔ اس کی سوچوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں پر بجلیاں سی تھرکتی رہتی تھیں۔ اس کا انگ انگ کرنٹ سے بھر جاتا تھا۔ تبھی تو شوکت اس کے ہاتھوں اور لبوں کو چھوتا اور پھر ''سی'' کر کے یوں پرے ہو جاتا جیسے کرنٹ چھو لیا ہو۔ اور پھر اچانک ہی 440 وولٹ کو گلے لگا لیتا۔

شوکت دور پار کا رشتہ دار تھا۔ اس کی اکلوتی بھابھی کا رشتے کا بھائی۔ پہلے پہل تو بھابھی نے ناک بھوں چڑھایا کہ اسے شوکت پسند نہ تھا۔ مگ جب روبی کی جانب جھکاؤ دیکھا تو نند کو گھر سے دھکا دینے کے امکان کو ذہن میں رکھ کر وہ شوکت کو بڑھاوا دینے لگی اور شوکت کا اس گھر میں آنا جانا مزید بڑھ گیا۔ ماں نے کچھ کہنا چاہا تو بھابھی نے روبی کی جوانی کی جانب اشارہ کر دیا...... اگلے وقتوں کی ماں کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ٹی وی، ریڈیو پہلے ہی آگاہ کر چکے تھے سو وہ آنکھیں موند کر کڑوا گھونٹ پینے لگی۔ اگرچہ وہ دونوں کو نظر میں رکھتی تھی...... مگر ایسی کڑی نظروں سے بھلا جوانی کے ابال رکتے ہیں اور شوکت تو جیسے شہد سا قطرہ قطرہ نچڑنے لگا۔

شوکت کا ہر وقت آنا جانا، کھلم کھلا روبی سے یوں باتیں کرنا جیسے وہ کل ہی اس کی ماں کی بہو بننے والی ہے۔ ایسے حوصلے کا باعث تھا۔ مگر جب یہ آنا جانا کچھ زیادہ لمبا ہو گیا تو بھابھی نے سیدھے سیدھے ایک دن شوکت کو آڑے ہاتھوں لیا...... جواباً شوکت نے آنکھیں مچکا مچکا کر صحن میں چلتی پھرتی روبی کے انگ انگ کو نظروں سے ٹٹولتے ہوئے کہا ''بس اس جمعرات کو سمجھیں بات پکی ہو جائے گی اماں کے آتے ہی''۔ بھابھی کی زبانی یہ خبر ماں کو شاد کر گئی۔ کیونکہ تین دن بعد تو جمعرات تھی۔ وہ دل

ہی دل میں گھر میں پڑے بستروں، چاولوں، برتنوں اور گوشت کا حساب کتاب کرنے لگی۔ مہمانوں کی تعداد اور روبی کے چند ریڈی میڈ سوٹوں کی قیمت کا انگلیوں پر تخمینہ لگاتے وقت لگا وہ تسبیح کر رہی ہے۔

اگلے دن بھابھی اور ماں نے کھسر پھسر کی ...... روبی کو گھر چھوڑ کر دونوں بازار چل دیں۔ آج تو خریداری کا لمبا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام ایس ایم ایس کے ذریعے شوکت تک پہنچا۔ بھائی تو ویسے بھی ہفتے کی رات آتا اور اتوار کی رات چلا جاتا تھا۔ ہاں کبھی کبھار بھابھی ضد کرتیں اور پیر کی صبح منہ اندھیرے جاتے جاتے سب سے چھپ کر بھابھی کو گلے لگاتا اور نکل جاتا۔ اس سنسنی خیز منظر نے روبی کی کئی بار نیندیں حرام کی تھیں۔ سو وہ دن ...... شوکت اور روبی کی محبت پر مہر کا دن تھا۔

''جمعرات کون سا دور ہے، کل ہی تو ہے!۔ مہینے بھر میں میری دلہن بن کر آ جاؤ گی میرے گھر'' شوکت کی آواز روبی کو جانے کیوں کھوکھلی سی لگی۔ ماڈرن ازم کے تمام شوق کے باوجود ...... طوفان کے تھم جانے کے بعد اب روبی خود کو بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔ پیاس اس کے حلق میں انگلیاں چبھو رہی تھی ...... اندر کی دقیانوسیت ماڈرن ازم کے سبق پر حاوی ہو رہی تھی۔ ''اچھا اب بور نہ کرو'' شوکت نے ہلکی سی خفگی کے ساتھ اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اب مرحلے آسان تر تھے۔ ویسے بھی بھوک کی حالت میں ہر ڈش اچھی لگتی ہے۔

شام کو لدی پھندی بھابھی اور ماں کو روبی کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا لگا ...... ماں نے پیار سے گلے لگا کر ماتھا چوما تو روبی کے دل کا چور آنکھوں کے راستے اتر آیا۔ بھابھی اور ماں اسے فطری شرم و حیا کا تقاضا سمجھیں۔ تسلیاں، نصیحتیں وہ جانے کیا کیا بولتی رہیں مگر روبی کا وجود تو روئی کی طرح دھنکا گیا تھا۔ وہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اندر کہیں دور

تک غبار پھیلا ہوا تھا۔ خوف، خوشی، سرور سب تھا لیکن وہ جو محبت کی تکرار سرخوشی پیدا کیا کرتی تھی۔ وہ جانے اب کہاں غائب تھی۔ رات جانے کتنی بار اٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جانے کتنی بار خوف نے اس کے اندر سے آواز دی اور پھر اس کے بعد کئی جمعراتیں گزر گئیں۔ شوکت کی Sim ہی بدل گئی۔ سیل فون کی بھی اور شاید زندگی کی بھی۔ سم کیا ہے۔ جب چاہے بدل لو ...... وہ تو تین مہینے بعد پتہ چلا کہ جمعرات کو تو شوکت کی دبئی کی فلائٹ تھی اور اسی شام روبی کے چکراتے سر اور چڑھی ہوئی آنکھوں نے تینوں عورتوں کو سمجھا دیا کہ اب ہر جمعرات کو انتظار کی شمع جلانے کی بجائے چڑھاوے کی اگر بتیاں جلانی پڑیں گی۔ عزت کے مزار پر ......

ماں اور بھابھی چادریں لپیٹے کہاں کہاں نہیں پھریں۔ مگر نہ تو دائیاں ہاتھ آ رہی تھیں نہ LHV۔ ''وہ زمانے گئے ...... اب تو پولیس کیس بن جاتا ہے کچھ گڑ بڑ ہو گئی تو ...... نا بابا نا کسی اور کے پاس جاؤ''۔ اب ہر در پر تو جانے سے رہیں ساس بہو ...... آخری حربے کے طور پر روبی کا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ گھر آنے والوں کے سامنے آنے پر پابندی لگ گئی۔ کبھی بخار، کبھی نیند اور کبھی کسی اور بہانے۔ ہر آنے والا دن روبی کی پلکوں، بدن اور ضمیر پر بوجھ بڑھائے جا رہا تھا۔ وہی بھابھی جو اسے گھر سے رخصت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اب کسی کنوئیں میں دھکا دینے کی متمنی تھی ...... شکر ہے بھابھی نے بھائی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ شوکت اس کا اپنا رشتہ دار تھا۔ ورنہ تو سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ چکا ہوتا۔

پھر وہ رات آ ہی گئی۔ جب روتی، سسکتی، بلکتی روبی کے تن سے اس کا گوشت برآمد ہوا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ رات کی تاریکی میں جانے کب کہاں کیسے اوجھل بھی ہو گیا۔ اپنی چیخیں روکنے کی کوشش میں روبی کے ہونٹ رسنے لگے ...... تکیہ جگہ جگہ سے

ادھڑ گیا۔ کسی اَن دیکھے وجود کی نرمی اسے اپنے بدن پر محسوس ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ سوگئی...... ایک لمبی نیند۔ آنکھ کھلی تو شاید اگلی رات کا پہلا پہر تھا۔ اس کی چھاتی میں درد کے بگولے اٹھنے لگے۔ اگلے ہی لمحے قمیض بھیگنے لگی۔ کوکھ میں ٹیس اٹھی، وہ دہری ہوگئی...... تب اچانک ہی اس کے جسم وجاں کے سارے درد جاگ اٹھے۔ سر موڑ کر دیکھا تو دوسرے پلنگ پر ماں جانے سوتے میں بھی جانے کیوں کانپ رہی تھی......

دھیرے دھیرے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ بھیگی قمیض پر ہاتھ پھیرا تو کچے دودھ کی خوشبو نے پھر کوکھ سے کچھ پوچھا۔ وہ گھسٹتے ہوئے اٹھی...... ماں کے پلنگ پر، کمرے میں، بھابھی کے کمرے میں کچن میں، غسل خانے میں پورا گھر چھان مارا ...... کہاں ہے وہ......؟ پھر احساس ہوا کہ گالی بن جانے والی چیزیں سینے سے نہیں چمٹائی جاتیں...... وہ تو...... نہیں ...... نہیں ...... وہ لرز اٹھی۔ ماں کا چہرہ دیکھا غور سے ...... کیا ماں ایسا کرسکتی ہے یا پھر بھابھی......؟ کہاں گیا وہ؟ وہ گالی جیسا کوڑا کرکٹ۔ جانے کیسی وحشت نے ڈیرا ڈالا اس کے دل ودماغ پر۔ اس نے لرزتے کانپتے وجود کو چادر سے ڈھانپا اور گرتی پڑتی باہر کا دروازہ کھول کر تاریکی میں گم ہوگئی۔

یہ سب کیا ہے؟ سب کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سا...... میرا جسم اکڑ رہا ہے...... ہاتھ پاؤں ہلاتا ہوں ...... تو لگتا ہے کسی چیز نے باندھ رکھا ہے۔ عجیب سے بدبوئیں ہیں...... میں کہاں آگیا ہوں؟ وہ نرم گرم سا احساس...... جس میں مرضی سے تیرتا رہتا تھا...... ننھی سی محفوظ سی دنیا تھی۔ کتنا ہلکا پھلکا شانت سا وجود لگتا تھا۔ اب تو لگتا ہے کہیں نیچے ہی نیچے دھنس رہا ہوں ...... اف کتنی گھٹن ہے۔ یہ کیا چبھ رہا ہے میرے جسم میں...... اب تو میں اٹھ بھی نہیں سکتا...... کمر دکھنے لگتی ہے...... یہ کیسی اجنبی سی دیواریں ہیں چہار طرف...... شوں شوں...... ساں ساں...... ٹپ ٹپ...... تیز

...... ہلکا شور...... کبھی زیادہ ہونے لگتا ہے۔ کتنی کرخت لگتی ہیں۔ اف میرے کانوں کو کچھ ہونے لگا ہے۔ کہاں گئی وہ نرم سی آواز جو کبھی ہولے ہولے گنگناتی تھی...... مجھ سے باتیں کرتی تھی...... رونے لگتی کبھی ہنسنے لگتی...... مجھے کہانیاں سناتی تھی...... سمجھ تو نہیں آتی تھی مگر اس کی آواز اس کے الفاظ مجھے بھلے لگتے تھے۔ میں جھولے میں جھولتا رہتا تھا...... اک آواز کے ساتھ۔ بر نرماہٹ تھی، سرسراہٹ تھی میٹھی میٹھی سی ...... نہ بھوک نہ پیاس۔

ہاں یاد آیا...... کافی دیر سے میرا حلق خشک ہے...... مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے اور پیاس بھی...... گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا رہا ہوں میں مگر وہ نرم سی آواز کوئی جواب ہی نہیں دے رہی...... جانے وہ کہاں چلی گئی......؟ یہ شڑ شڑ...... آوازیں...... یہ میاؤں میاؤں غرغراہٹ سی ...... یہ کیا ہے؟ ہلکی سی روشنی کہاں سے آرہی ہے...... عجیب عجیب سے سائے میری جانب بڑھ رہے ہیں...... وہ آپس میں غرا رہے ہیں...... مجھے ڈر لگ رہا ہے...... لگتا ہے یہ سب مجھ پر حملہ کرنے آرہے ہیں...... وہ نرم آواز والی کہاں ہے...... مجھے بچانے کیوں نہیں آرہی......

میں بچنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہوں مگر میرے اردگرد کچھ لپٹا ہوا ہے ...... اور میری کمر تو بالکل چپک گئی ہے...... نیچے کسی چیز سے...... اف...... اتنی درد...... میرا بازو...... پھر ایک غراہٹ اور ایک مہین سی چیخ......

منہ اندھیرے کوڑے والا ٹرک ...... شور مچاتا کھیل کے میدان کے قریب دھرے کوڑے دان کے قریب آن کر رکا...... کتے بلیوں کا ایک غول...... آپس میں لڑ جھگڑ رہا تھا۔ معمول کے مطابق ...... کوڑا اکٹھا کرنے والے سٹاف نے دو چار گالیوں سے نواز کر انہیں بھگایا...... مگر ایک کتا وہیں رکا مسلسل کسی چیز کو بھنبھوڑ رہا تھا...... سٹاف

نے اس کی کمر میں ایک لات ماری۔ کتا چاؤں کرکے پرے ہٹا مگر...... چند قدم دور رک گیا......اس کا منہ خون سے بھرا ہوا تھا......سٹاف کی نظر پڑی...... گوشت کا لوتھڑا کوڑے کے درمیان نظر آیا......اس نے کتے کو گالی دی......اور کوڑا اٹھانے لگا مگر یہ کیا ......؟ ایک ننا سا ہاتھ کہنی تک ادھڑا ہوا خون آلود لوتھڑے کے قریب پڑا تھا۔ شفیق نے ایسی کہانیاں سنی تو بارہا تھیں مگر ایسا منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی گالی اور سانس ایک ساتھ رکنے لگی......وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے ساتھی کو آواز دینا چاہی مگر......الفاظ دم توڑ گئے......اور حلق سے آواز کی بجائے ایک ابکائی برآمد ہوئی......شفیق کو لڑکھڑاتے اور ٹرک کے ساتھ ٹیک لگاتے دیکھ کر ساتھی متوجہ ہوا......شفیق کے قریب آیا، اس کی حالت دیکھ کر پوچھنے لگا...... ''شفیق خیر تو ہے......''

شفیق کچھ نہ بول پایا لیکن چہرے پر کھنڈی وحشت ......خوفزدہ نگاہوں نے ساتھی کو سمجھا دیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس کے دوبارہ استفسار پر شفیق نے نظریں گھما دیں ......ساتھی کی آنکھوں نے اس کی نظروں کو پیچھا کیا......کہنی تک ادھڑا ہوا ننھا سا ہاتھ ......اس کا بھی دل خراب ہو گیا......لیکن وہ ان حالات کا عادی تھا......اس نے شفیق کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے سہارا دے کر ٹرک کے اگلے حصے میں بٹھاتے ہوئے بولا ''ابھی نیا ہے نا...... یہاں تو جانے کتنے ادھڑے کٹے پھٹے جسم تجھے ملیں گے ......حرام کے جنوں کے۔ چل رہنے دے میں سنبھال لوں گا......''

یہ جملے درخت کے پیچھے چادر میں لپٹی کانپتی لرزتی روبی کے دل پر کسی پتھر کی طرح گرے......وہ لڑکھڑا کر نیچے بیٹھتی چلی گئی......منہ سے نکلنے والی سسکی کو اس نے حدود کے کونے میں باندھ لیا...... منہ سے نکلنے والی چیخوں اور کوکھ سے اٹھنے والی ٹیسوں کو دبانے کی کوشش میں وہ گٹھڑی بن گئی۔ چند لمحوں بعد ٹرک شور مچاتا وہاں سے

چلا گیا......روبی کچھ دیر بعد ایک موہوم سی آس پر پھر اٹھی...... ''ضروری تو نہیں کہ جو میں سوچ رہی ہوں وہ صحیح ہو......لیکن میرے گھر کے قریب تو یہی جگہ پڑتی ہے......'' اس نے دور دور تک پھیلے میدان کو دیکھا...... یہاں چند گھر ہی تھے......اور ان کے قریب یہ کوڑے دان......وہ دل کی گواہی کو جھٹلانے پر تلی تھی۔ تقریباً گھسٹتی ہوئی وہ کوڑے دان تک پہنچی...... جہاں بچا کھچا کوڑا کہیں کہیں گرا پڑا تھا۔ ندیدے کتے بلیاں منڈلا رہے تھے......

روبی انہیں پتھر مارنے لگی...... کتے چاؤں چاؤں کرکے دور جا کھڑے ہوئے ......اور تھوتھنی پر لگے خون کو چاٹنے لگے...... بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ادھر ادھر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اچانک ہی روبی پاگلوں کی طرح بچے کھچے کوڑے کو ٹٹولنے لگی......مگر کچھ ہاتھ نہ آیا......سوائے ایک خون آلود دھجی کے......اس نے غور سے دیکھا......دھجی کو الٹا پلٹا......اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ زمین پر گر گئی......

وہ دھجی اس کی اسی چادر کا حصہ تھی جو چادر......کبھی نہ آنے والی جمعرات کے لیے ......اس کی ماں لائی تھی......۔

☆☆☆

کیکٹس

وہ دونوں سرسبز پارک کے ایک طرف بنچ پر دھوپ سینک رہے تھے۔ حمیدہ نے اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی۔ دوسری جانب کے بنچ پر اپنا بیگ رکھا اور تھکے تھکے انداز میں وہاں بیٹھ گئی۔ آج اسے ڈھیروں نوٹس بنانے تھے اور صبا ابھی تک نہ پہنچی تھی۔

''Avari اور Sharaton کے مقابلے میں اب Flaties جچتا تو نہیں، مگر رات ہی گزارنی ہے نا۔ جتنا ریٹ کم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔'' یہ علی تھا۔ اس کا لہجہ سسکاری سے مشابہہ تھا، مگر Sharaton کی بات ہی اور ہے۔ چار پیسے لگ تو جائیں گے مگر جو مزہ Sharaton کی رات کا ہے وہ Flaties میں کہاں؟'' عارف کا لہجہ چٹخارے دار تھا۔

''نام سن کر ہی شیرون سٹون کا تصور آ جاتا ہے۔۔۔ ہے نا؟'' علی نے ایک معنی خیز قہقہہ لگایا۔ حمیدہ کے تن بدن میں جانے کیوں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ پیروں سے چڑھتی چڑھتی چیونٹیاں گردن پر آ کر رینگنے لگیں۔ اس نے بہت کوشش کی خود کو باز رکھنے کی مگر اچانک ہی اس کی زبان کا ٹریگر دب گیا۔

''you shut up cheapsters'' وہ دونوں دفعتاً گھومے۔ انہوں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے سراپے پر نظر کی، دونوں کی آنکھوں میں بیک وقت

چمک لہرائی۔ ایک شرارہ سا لپکا۔

''حمیدہ کیا ہوا تمہیں؟'' عارف نے پوچھا۔ وہ مزید تپ گئی۔ اتنا ان رومنٹک نام!۔۔۔

کوئی پکارتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی برتن دھونے یا صفائی کرنے کے لئے بلا رہا ہو۔ چیونٹے اب اس کے دماغ کو چڑھ گئے تھے۔ لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں لپکتی آگ دیکھ کر اس نے زیرِ لب ان دونوں پر لعنت بھیجی اور تیز تیز قدموں سے ڈیپارٹمنٹ کی جانب چل پڑی۔

اور وہ جو evil Genius مشہور تھا۔ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اگلے ہی دن ساری یونیورسٹی میں، ہر دیوار پر، ہر درخت پر Flaties کے کیلنڈر لٹک رہے تھے۔

وہ صبا کے ہمراہ یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چیونٹے پاؤں سے چڑھے رینگتے رینگتے آنکھوں سے جھانکنے لگے۔

''wow'' صبا مسکرائی۔

حمیدہ کے کھلے لب آہستہ آہستہ ملے۔ اس نے انہیں بھینچ کر بند رکھنا چاہا مگر وہ دوبارہ کھل گئے۔ آپ ہی آپ ایک موٹی سی خالص مردانہ گالی کے ساتھ ''ان کی۔۔۔''

''تمہیں کیا ہوا؟'' اب ہونٹ کھولنے کی باری صبا کی تھی۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' نہ جانے کیوں وہ صبا سے نظریں چرا گئی اور دوپٹہ سینے پر پھیلا لیا۔ صبا اس کی فطرت سے واقف تھی۔ جانتی تھی کہ خود ہی تھوڑی دیر میں سب کچھ اُگل دے گی۔ زیادہ دیر پیٹ میں بات رکھنا حمیدہ کے بس میں نہ تھا اور وہی ہوا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کیفے ٹیریا میں بیٹھی دانت پیس پیس کر وہ صبا کو کل کی

روداد سنا رہی تھی۔ ''لیکن اس سارے قصے میں تم کہاں سے آن ٹپکیں؟'' صبا حیران ہوکر بولی۔ ان کی راتیں Flaties میں گزریں یا Avari میں، تمہارا کیا جاتا ہے؟

اوفوہ۔۔۔بھئی تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ اصل میں کانونٹ میں میری چھیڑ Flaties تھی۔'' حمیدہ نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اقبالِ جرم کیا اور پھر دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی یونہی۔ صبا کے Confusion کو حمیدہ کے سراپے نے دور کردیا۔ صبا نے ایک اچٹتی سی نظر اس کی کمر اور شانوں کے درمیان ڈالی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولی۔

''فار گاڈ سیک حمیدہ۔ اتنی کمزور نہ بنو۔۔۔'' اس مسئلے پر غور کرتے ہیں۔۔۔ چائے پی لو پہلے''

علی اور عارف خود تو جانے کہاں غائب تھے مگر پوری یونیورسٹی اسے آنکھیں مارتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے راز سے ساری دنیا واقف ہوگئی ہے۔ اس کی کمزوری پر ہنس رہی ہے۔ یہ سوچ کر حمیدہ کے سینے پر دوپٹہ پھیلانے کے عمل میں تواتر آتا گیا۔

وہ خود کو اس بادشاہ کی طرح محسوس کر رہی تھی جو ٹھگوں کے کہنے پر فرضی ریشم کا لباس پہن کر رعایا میں چلا گیا تھا اور ایک بچے نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا تھا ''بادشاہ تو ننگا ہے''

حمیدہ کو ہر درخت کی ہر شاخ ایک انگلی اور ہر دیوار کی ہر اینٹ ایک آنکھ محسوس ہو رہی تھی، شرارت سے طنز سے مسکراتی آنکھ۔

اس نے کنکھیوں سے صبا کے کھلتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا نظریں اس کی مرمریں گردن سے ہوتی ہوئیں اس کے لاکٹ پر جم گئیں۔ جو کسی خم میں الجھا لرز رہا

تھا۔ وہ صبا کا ہاتھ پکڑ کر یکدم ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ بیک وقت نفرت، محبت اور غصے سے مغلوب ہو کر اس نے صبا کی گردن جکڑنے کی بجائے اس کا کاندھا پکڑ کر اس پر اپنا سر رکھ دیا۔

وہ دونوں کالج کے زمانے سے بہت قریب تھیں۔ اکٹھے چار سال ٹیچرز کو تنگ کرتے، سرگوشیاں کرتے اور امتحان کے دنوں جبری طور پر روٹھ کر پڑھائی کرتے ہوئے گزار دیئے۔ صبا کی دلکش ہنسی اس کو یونیورسٹی میں پاپولر بنائے ہوئے تھی۔ حمیدہ اس کی دوستی پر نازاں تھی۔ اس کی اپنی آنکھوں کا سحر ایسا تھا کہ اگر پیمانۂ محبت صرف آنکھیں ہی ہوتیں تو وہ ملکہ کا خطاب پاتی مگر مار وہاں کھاتی تھی جہاں فرشتوں کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔

یونیورسٹی کے لڑکے جب صبا کے گرد طواف کرنے لگے تو وہ کھٹکی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ صبا کی چھلنی سے چھل کر ایک آدھ مسکراہٹ اس پر بھی چپک جائے۔ مردانگی سے چھلکتا کوئی کرخت سا چہرہ اپنی چیتے سی نگاہیں اس کے بدن میں بھی کھبو دے۔ اس طرح کہ وہ بے اختیار تڑپ اٹھے۔ پگھل جائے وہ یونہی۔ ایسے ہی۔۔۔

مگر سوائے چند مرگھلے سے لڑکوں کے بونگے سے Comments کے، کسی نے اس پر کوئی ایسا فقرہ نہ کسا جسے سن کر کم از کم اس کے کان ہی سرخ ہو جاتے یا ایک آدھ قدم ہی غلط پڑ جاتا اور ادھر صبا کو لڑکے نظروں سے چھو لینا چاہتے۔ جملوں سے کاٹ کھانا چاہتے تھے۔

پانچ فٹ آٹھ انچ کی سوکھی سڑی حمیدہ سے یوں بچ کر گزرتے تھے کہ ٹکرا گئے تو چوٹ لگ جائے گی۔ انہیں کیا پتہ چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑ رہا ہے اس کھمبے میں۔

اور جب علی نے ہزاروں منتوں کے ساتھ حمیدہ کے آگے صبا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس کا جی چاہا کہ علی کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ ''کیا میں تمہیں نظر نہیں آئی؟ کیا کچھ نہیں کیا تمہیں متوجہ کرنے کے لئے کبھی اسٹائل بدل کر کبھی زاویوں، قوسوں کو ابھار کر جائز اور ناجائز انداز سے کبھی گھنیری پلکوں کو مسکارے سے مزید بوجھل کیا۔'' اب اسے کون سمجھاتا کہ لوگ بہت پریکٹیکل ہو گئے ہیں۔ مسکارے کا جادو صرف مسکارا بیچنے کے کام آتا ہے۔ علی کو صبا کے عشق میں مبتلا دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے سارا مسکارا پگھل کر اس کے چہرے، اس کے بدن پر پھیل گیا ہو۔ سیاہ تارکول کی مانند کاجل چپکتا، پھیلتا اور بہتا رہا۔ وہ بار بار اپنی گردن اور چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''آر یو آل رائٹ۔۔۔؟'' علی نے پوچھا۔

''پتہ نہیں چکر سا آ رہا ہے۔'' وہ واقعی نڈھال سی تھی۔

'' آؤ تمہیں ڈیپارٹمنٹ پہنچا دوں'' علی نے اپنا چوڑا چکلا سا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ حمیدہ کی گردن پر تارکول کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے چیونٹے بھی رینگنے لگے۔ اس نے خلوصِ دل سے اس لمحے طوفانِ نوح آنے۔۔ یا زمین میں دھنس کر حنوط ہو جانے کی دعا مانگی، مگر خواہش تو خواہش ہے اور حقیقت کسی بدصورت بڑھیا کی طرح دانت نکوسے اسے ڈرا رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر روح کو سمیٹ کر کہیں دور لے گئی اور علی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ لہجہ خشک تھا۔

"No thanks"

کئی دن کٹی کٹی رہنے کے بعد اس نے اپنی محبت کے مزار پر بھائی جان کا جھنڈا لہرا دیا اور فرار کے تمام راستے مسدود پا کر علی سے بول چال شروع کر دی۔

علی نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر 'حدیثِ دل صبا کے نام' اسے سنانا شروع کر

دی۔ حمیدہ وہ تمام الفاظ اپنی خواہش کے مطابق اپنی جانب منعکس کرنے لگی اور بچا کھچا جا کر صبا کے دامن میں ڈال دیتی۔

صبا علی کی باتیں سن کر کہتی:

''ان سب کی رال ہر لڑکی پر یونہی ٹپکتی ہے۔۔۔''

''تو پھر مجھ پر کیوں نہیں؟''

حمیدہ کے دل پر یہ جملہ عذاب کی طرح نازل ہوتا مگر وہ محض صبا کو گھور کر رہ جاتی۔ ایک دن اچانک ہی حمیدہ پر انکشاف ہوا کہ صبا تو پرلے درجے کی فلرٹ ہے۔ کبھی ایک کے ساتھ تو کبھی دوسرے کے ساتھ۔ جس کے ساتھ جی چاہتا کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر حمیدہ کا دل پہیوں تلے کچلتی ہوئی یوں نکل جاتی جیسے Guided Missile۔ وہ ہر مرتبہ سوچتی کہ اب کی بار وہ صبا کو کھری کھری ضرور سنائے گی۔ لعن طعن کر کے اس جیسی Loose Character لڑکی سے دوستی توڑ لے گی مگر جونہی صبا کا No Comments قسم کا چہرہ دیکھتی، صرف اتنا ہی کہہ پاتی:

''کیسا تھا نیا ایڈونچر۔۔۔''

''اے ون'' صبا شرارت سے آنکھ میچ کر انگھوٹھے اور شہادت کی انگلی کا ایک دائرہ سا بنا کر حمیدہ کی دکھتی رگ کے قریب گردن کے پاس رکھ دیتی۔ حمیدہ کی تمام تڑپ اس دائرے میں قید ہو کر رہ جاتی۔

''کیوں نہ میں بھی۔۔۔؟'' اس نے کئی بار دھیرے دھیرے گول پتھروں کو اپنے جوتے کی نوک سے ٹھوکر مارتے ہوئے سوچا۔ حمیدہ کی سوچیں ایک دن حقیقت میں ڈھل گئیں۔ جب بیالوجی کا ایک قدرے کالا سا، عام سا لڑکا جو کئی دنوں سے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے تک رہا تھا، اسے کیفے ٹیریا لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ بیچارہ کیا کامیاب ہوتا، اصل میں حمیدہ ہی نے اسے کامیاب کیا۔ چند دن کے اندر اندر وہ اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے ہوتی ہوئی اس کے کمرے تک جا پہنچی۔ Mothernature کے تمام تقاضے پورے کرنے کے بعد پھر وہیں آ گئی جہاں تھی۔ Thrill تو Thrill ہوتی ہے، صرف خون میں ابال پیدا کرتی ہے۔ جذبوں سے اسے کیا لینا دینا تھا۔ وہ خود کو گیس کے اس غبارے سا محسوس کرنے لگی، جس کی گیس نکل جانے کے بعد چرمراسا ربڑ کا ٹکڑا باقی رہ جاتا ہے اور بس۔

اسے ڈپریشن ہونے لگا۔

''مگر صبا کا چہرہ تو کچھ اور کہتا تھا۔ میرے چہرے پر کچھ اور کہانی ہے۔ اس نے اپنے عکس سے پوچھا مگر آئینہ چپ رہا وہ صبا کا چہرہ اپنانے کے لئے پوری شد و مد کے ساتھ میدان میں کود پڑی۔ تھرل کے لئے ضروری تو نہیں کہ پہاڑ سرسبز ہی ہوں۔ کبھی کبھی سنگلاخ چٹانیں بھی سر کرنا پڑتی ہیں۔ سو بہت سے لڑکوں نے یہ مٹیالا پہاڑ سر کیا مگر وہ Cliff hanger نہ آیا جس کا حمیدہ کو انتظار تھا۔

''یہ تم کن راستوں پر چل پڑی ہو۔۔۔؟'' صبا نے ٹوکا

''تم نے مجھے پوچھا تھا۔۔۔'' وہ تڑ سے بولی

صبا نے حیرت سے اس کا چہرہ پڑھا۔ انجان تحریر دیکھ کر صبا نے لب سی لئے۔

دونوں پھر اپنے اپنے مدار میں گم۔۔۔ مست کبھی بے چین اور کبھی افسردہ

فائنل قریب تھے۔ صبا نے ایک دن اسے راستے میں روکا۔

''سنو ایک خبر ہے۔ تم سے Share کرنا چاہتی ہوں۔''

جانے اس آواز میں کیسی کھنک تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی حمیدہ کو رکنا پڑا۔

پوچھو گی نہیں کیا۔۔۔؟''

صبا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ حمیدہ چپ رہی۔

''مجھے علی نے پروپوز کیا ہے اور میں نے ہاں کر دی ہے۔''

صبا نے کھنکتے لہجے میں Announce کیا۔

دھڑ دھڑ دھڑ۔۔۔ ڈیپارٹمنٹ کی تمام دیواریں ایک ایک کر کے اس پر آن گریں۔ اس نے کراہتے ہوئے خود کو سنبھالا اور نہ چاہتے ہوئے تلخ سا جملہ پھسل پڑا؛

''اور وہ جو تمہارے عاشقوں کی لسٹ تھی۔ اس کا کیا ہوگا؟''

صبا کا چہرہ بجھ سا گیا۔

حمیدہ کے اندر دور کہیں شرلی سی چلی۔

''آؤ تمہیں ساری بات بتاؤں۔۔۔''

صبا نے اسے گھسیٹا۔ حمیدہ نے جان بچانا چاہی۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے، لائبریری بند ہو جائے گی۔''

تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر حمیدہ کو کچھ چین ملا تھا۔ وہ صبا کو اسی طرح تڑپتا چھوڑ کر جانا چاہتی تھی، مگر صبا نے جیسے حمیدہ کے بازو میں پتھر گاڑ دیئے۔ صبا کا چہرہ انتہائی سنجیدہ تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ حمیدہ کو خوف آنے لگا۔

صبا پھنکاری۔

''میں نے کئی بار کوشش کی تمہیں روکنے کی مگر تم کب اور کس طرح اتنی دور نکل گئیں۔ میں نہیں جانتی۔''

اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ جب علی کو سب پتہ چلے گا۔ خواہش، اندیشے کی کینچلی پہنے حمیدہ کی زبان پر آ گئی۔

''علی تم سے زیادہ جانتا ہے اور وہ بھی جو تم نہیں جانتی۔''

صبا کا لہجہ اتنا اٹل تھا اتنا پر اعتماد کہ حمیدہ اندر تک لرز گئی۔ کسی انہونی کے ڈر سے صبا بولی۔

’’حقیقت وہ نہیں تھی جو تم اور تمہارے جیسے کئی بودے لوگ سمجھتے رہے یاد رکھو۔ تمام پھولوں کا رس چوسا نہیں جا سکتا۔ کچھ پھول ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے مسحور ہونے والے کیڑے مکوڑے ایک فاصلے پر ہی گر جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے والے کانٹوں میں پروئے جاتے ہیں یا زہر سے مر جاتے ہیں۔ کیکٹس کے پھول کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ سمجھیں۔۔۔؟‘‘

حیرت سے کھلے منہ کے ساتھ حمیدہ کو یوں لگا جیسے واقعی Flaties کی وہ طویل راہداری ہے جسے آتے جاتے قدم روندے جا رہے ہیں، روندے جا رہے ہیں، آخر تک۔

☆☆☆

گھونسلے

جیل بھر کا کوڑا کرکٹ یہاں جمع کیا جاتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ایک ٹرک شور کے ساتھ یہاں آن لگتا تھا۔۔۔ دو گارڈ دھمکی آمیز چہروں کے ساتھ اُس کی کھڑکی پر آن کھڑے ہوتے۔ جتنی دیر ٹرک رُکا رہتا۔۔۔ اس کی سانسیں بھی رکنے کی کوشش کی جاتی۔۔۔ ٹرک روانہ ہو جاتا تو گارڈ کراہت آمیز چہروں کے ساتھ اس پر کوئی نہ کوئی جملہ اُچھال کر چلے جاتے۔

دھیرے دھیرے پھر وہاں کوڑا جمع ہونے لگتا، بچا کھچا کھانا، شاپر، ٹوٹے برتن۔۔۔ چیتھڑے۔۔۔ ڈھیر اُونچا ہونے لگتا۔۔

فضا میں کوّے چکر کاٹنے لگتے۔ بلیاں ڈھیر پر بھاگنے اور غرّانے لگتیں۔۔۔ کبھی کبھی تو کوؤں اور بلیوں کی لڑائی شروع ہو جاتی۔۔۔ کبھی ہڈیاں، بوٹیاں اور روٹی کے ٹکڑے کوؤں کے ہتّھے چڑھ جاتے اور کبھی بلیاں سبقت لے جاتیں۔

کیا زندگی بھی کوڑے کا ڈھیر ہے۔۔۔ اور ہم سب کوّے اور بلیاں۔۔

وہ سوچتی اور پھر خود ہی بے معنی سی ہنسی ہنس دیتی۔۔۔ جسے سننے والا کوئی نہ ہوتا۔۔۔ سوائے اس کے اپنے۔

اُس نے چُندھی چُندھی آنکھوں سے دیکھا۔ سورج کی کرنیں کھڑکی کے اُوپری سرے تک آن پہنچی تھیں۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے خشک زرد لبوں پر رینگنے لگی۔ اپنے بھاری بھر کم تھکے ہارے وجود کو فرش پر گھسیٹتے ہوئے۔ وہ کھسکتی ہوئی دیوار کے ساتھ پاؤں پسار کر بیٹھ گئی کہ زیادہ دیر اُکڑوں بیٹھنا یا کھڑا ہونا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔۔۔ جیل کا کھانا تو وہ زہر مار ہی کرتی تھی۔ لیکن شاید خون کی کمی یا دل کے

ساتھ ساتھ جسم کا نظام بھی بگڑ جانے کے باعث۔۔۔اس کا معدہ اکثر کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔۔۔مگر جسم کسی بے رنگ غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا۔۔۔اس نے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی کی جانب دیکھا جہاں ایک کالی بلی۔۔۔اپنی سبز سبز آنکھیں ایک مرتے ہوئے کاکروچ پر گاڑے بیٹھی تھی۔۔۔بلی یوں گھات لگائے چوکنّی تھی جیسے ابھی وہ کاکروچ پر حملہ کر دے گی۔۔۔اور ہوا بھی یوں ہی۔مگر شومئی قسمت اُسی پل اچانک ایک دوسری بلی نے تیزی سے حملہ کر کے کاکروچ کو پنجے میں دبوچ لیا۔

عمر بھر کاکروچ سے کراہت محسوس کرنے والی زینت کو اُس کاکروچ کی بے بسی پر بے انتہا ترس آیا۔شاید کاکروچ کی اور اپنی حالت کا کسی زاویے سے موازنہ کر رہی تھی وہ۔

کالی بلی نے ناکام ہو کر۔۔۔کھسیانی ہو کر کھمبا نوچنے کی بجائے پوری بلی کو نوچ ڈالا۔۔۔دونوں کافی دیر تک غراتی اور لڑتی رہیں۔کاکروچ بے چارہ ایک جانب بے دم سا پڑا رہا۔۔۔حتیٰ کہ ٹرک کے شور نے۔۔۔۔دونوں بلیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

زینت نے غور سے دیکھا کہ کاکروچ اُلٹا پڑا، دھیرے دھیرے اپنی ٹانگیں چلا رہا تھا۔سیدھا ہوتے ہوئے قابو نہ آنے والا کاکروچ اُلٹا ہو کر کتنا بے بس سا لگ رہا تھا۔۔۔یہ سیدھا تو نہیں ہو سکتا۔۔۔چلو زندہ تو ہے۔۔۔یہ سوچ کر زینت کا دل اچانک ہی ایک انوکھے سے اطمینان سے بھر گیا۔یہ وہی زینت تھی جو رات بھر گھر میں کاکروچ مارنے کا سپرے ہاتھ میں لیے گھومتی پھرتی تھی۔کاکروچ، چھپکلیاں، ٹڈیاں، مکھیاں اور مچھر۔۔۔اس کے ازلی دشمن تھے۔

وقت کس طرح ذہن وقلب کی ماہیت بدل دیتا ہے یہ زینت کو سمجھ میں آ رہا تھا۔
اس نے آنے والے ٹرک کو دیکھا۔۔۔ٹرک کا پچھلا حصہ کوڑے کے ڈھیر کے قریب آ کر رُک گیا۔جیل کے خاکروب عملے والی وردی میں ملبوس تین افراد چھلانگ مار کر اُترے۔انھوں نے کھڑکی سے لگی بھاری بھرکم سی عورت کو دیکھا جو وحشت بھری نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔تینوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی اور ہنس دیے۔
ان کی ہنسی میں تمسخر، عریانی صاف جھلک رہی تھی۔۔۔زینت نے زیرِ لب بڑبڑا کر ان کی کمینگی کے چہرے پر سلاخوں سے باہر منہ کر کے تھوک دیا۔

مگر کوڑے کے بیوپار میں ملوث لوگوں کا اس کا بے بس تھوک کیا بگاڑ سکتا ہے۔
اس کی نظریں مستقل کھڑکی کے اُوپر والے حصے پر جمی رہیں۔تھوڑی دیر کو روشنی ہم سفر بنی۔جو اس تاریک کوٹھڑی کی تنہائی کو کم کرتی تھی۔سورج کی مغرور کرنیں سہج سہج کر لمحوں کا فاصلہ صدیوں میں طے کر رہی تھیں۔آدھی کھڑکی تک ان کا پھیلاؤ۔۔۔ دوپہر کی علامت تھا۔دوپہر کا مطلب تھا۔۔۔ایک اور دن کی شکست۔۔۔اذیت بھرے ایک اور دن کا خاتمہ۔۔۔کتنی اُلٹ پلٹ سی ہو گئی تھی اس کی دنیا۔دِن روشنی اور اُمید کی علامت ہوتے ہیں۔

انھیں شکست دینا اس کے لیے زندگی کی نوید تھی۔دوپہر کا ڈھل جانا اس کی فتح کا سمبل بن جاتا تھا۔

عمارت کی اس کھڑکی کے ساتھ دونوں جانب اونچی لمبی دیواروں کے باعث دھوپ اچانک ہی بگڑے نصیب کی طرح رُخ بدل لیتی تھی۔سائے لمبے ہونے لگتے۔تاریکی دانت نکوسے اس کی جانب بڑھنے لگتی۔اس کا بھاری بھرکم وجود غیر محسوس انداز سے پرے کھسکنے لگتا۔۔۔دوسری جانب بھی سلاخیں تھیں اور سلاخوں کے

پار پہرے دار۔۔۔لمبی تاریک راہداری۔۔۔بوٹوں کی ٹھک ٹھک کی بازگشت۔۔۔ غلیظ گالیاں۔۔اور بندوقوں کی سرد نالیاں۔۔وہ اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہو جاتی۔۔

اگلی صبح پھر دُھندلکے سے، کرنوں کے کھڑکی پر اُترنے تک اور دوپہر کے بعد وہ اسی طرح آس نراس کے ساتھ ایک لمبے ذہنی سفر پر نکل جاتی، گرتی پڑتی، روتی سوچتی!

موٹی موٹی سلاخوں سے بنی یہ چھوٹی سی کھڑکی اگرچہ دُور تک ایک سیاہ کائی زدہ دیوار بدبودار نظارہ لیے ایستادہ تھی لیکن زینت کے لیے یہی منظر زندگی کا منظر نامہ تھا۔ جہاں سارا دن کتے، بلیاں، ڈھیروں کیڑے مکوڑے اور پرندے۔۔۔اپنی خوراک تلاش کرتے اور ایک دوسرے کو خوراک بنانے میں مصروف رہتے۔۔۔

زینت جانتی تھی کہ اس تعفن زدہ Cell میں اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دینے کی خاطر بند کیا گیا تھا۔

کئی بار شکست نے اپنی لمبی کالی زبان سے اس کے وجود کو اندر تک چاٹ لینے کی کوشش کی۔ بے تکے اور بے سروپا خیالات نے ذہن کی اندھی کھائیوں میں ٹھوکریں کھائیں۔زینت نے بارہا موت کے بارے میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا۔

کبھی کھڑکی کی سلاخوں سے سر ٹکرا کر۔کبھی Cell میں لگے غلاظت سے بھرے کموڈ میں ڈُوب کر۔۔۔''امکاناتِ مرگ'' پر بار بار سوچا۔۔۔لیکن کھڑکی سے آنے والی پُراسرار سرگوشیوں سے لبریز کرنوں اور دُور لمبی کائی زدہ دیوار میں اُکھڑی ہوئی چند اینٹوں کے درمیان ایک ننھے سے گھونسلے نے اس کے ہر خیال کو رد کر دیا۔

حیرت ہے اس کال کوٹھڑی میں آنے سے پہلے اس نے ایسی غیر اہم چیزوں پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔فرصت ہی کب ملی تھی؟ زندگی ایک سیلِ رواں تھی۔ جو ہاتھ لگا

اُٹھا لیا۔ جو نہ ملا جانے دیا۔ اتنا وقت کہاں تھا بھلا کہ ایک حقیر سے گھونسلے پہ یا سورج کی کرنوں کی رفتار پر غور کیا جاتا۔ بلکہ شاید اس نے سورج کو اُبھرتے ڈوبتے بھی بمشکل ایک آدھ بار ہی دیکھا تھا۔۔۔وہ تو شاید آسمان کا رنگ بھی بھول بیٹھی تھی اُن دنوں۔

اور یہ ننھا سا۔۔حقیر سا گھونسلہ۔۔؟ کیا اہمیت ہو گی جگہ جگہ بنے ہوئے ایسے ہزاروں لاکھوں گھونسلوں کی۔ جو تنکے اکٹھے کر کے بنائے جاتے ہیں اور پھر جلد ہی تنکا تنکا بکھر بھی جاتے ہیں۔زینت تو خود دن رات کئی چمکیلے۔مضبوط گھونسلوں میں گھری۔ نت نئے گھونسلوں کی تعمیر میں مگن تھی۔محبت کا گھونسلہ۔ دولت سے سیاست شہرت۔ جانے کیسے کیسے گھونسلوں کا انبار تھا آگے پیچھے۔

سڑک کنارے کسی درخت پر بنے یا پرانی عمارت کے کونوں کھدروں میں موجود ان حقیر گھونسلوں کے وجود سے وہ ہمیشہ بے خبر رہی۔

لیکن اب یہ چند کرنیں۔۔گھونسلے کے چند تنکے ہی اس کی دنیا تھے۔ وہ سلاخوں سے لگی ایک ٹک چڑیا کی پھرتی اور اس کے انہماک کا نظارہ کرتی رہتی۔۔۔نر اور مادہ کی چونچیں لڑانا، کبھی ایک کا آ بیٹھنا، کبھی دوسرے کا آنا۔کبھی دونوں کا پھڑ پھڑاتے ہوئے۔۔ایک وقت گھونسلے میں گھسنے کی کوشش کرنا۔۔اُن کے پیار و محبت کے لمحے وہ بڑی حسرت سے اپنے اندر اُتارتی۔۔۔اندر دُور تک۔۔۔

جہاں سے محبت نوچ کر نفرت بھری جا رہی تھی۔

چڑیا اور چڑا بار بار لٹک جانے یا گر جانے والے تنکوں کو بڑی جانفشانی اور شدو مد کے ساتھ اپنی ننھی ننھی چونچوں کے ذریعے مسلسل اندر دھکیلتے اور برابر کرتے رہتے۔ زندگی اور جدوجہد سے بھرپور فطرت کا یہ ڈرامہ اُس کے ذہن کے پردے پر

بار بار اُبھرتا اور ڈوب جاتا۔

سورج کی مغرور کرنیں۔۔کھڑکی کے درمیانے حصے کے ایک خاص نکتے تک آتیں۔کچھ دیر رُکتیں اور اچانک رخ بدل جاتیں۔زینت نے اِس نکتے کو کئی بار بچی کھچی دال لگا کر واضح کیا۔کرنیں روزانہ اسی نکتے تک آتیں۔۔۔کچھ دنوں بعد دال سوکھ کر جھڑ جاتی۔بس کالی سلاخ پر ایک مٹیالا سا داغ رہ جاتا۔۔۔جانے کیوں زینت کے اندر شدت سے خواہش جاگتی کہ کسی دن کرنیں اس داغ سے کچھ نیچے آ جائیں۔۔۔تاریکی میں روشنی کا احساس بڑھ جائے۔۔مگر سورج زینت کی کسی خواہش کے لیے کہاں اپنا صدیوں پرانا سفر بدلتا۔۔۔؟ سو تاریکی جلد ہی اپنا لبادہ پھیلاتی اور اسے ڈراتی رہی۔۔۔

اسی دوران گھونسلے کی تکمیل کا مرحلہ طے ہوا۔۔۔انڈے سینے اور پھر بچے نکلنے کا وقت آ گیا۔۔۔چوں چوں کی باریک باریک آوازیں زینت کو کسی خوش خبری جیسی لگنے لگیں۔انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ بچوں کو نہ دیکھ سکی۔۔۔ہاں، اُڑان سیکھنے کے دوران کبھی کبھار ان کی جھلک نظر آ جاتی۔۔کبھی گھونسلے کے کناروں۔۔۔کبھی کوڑے کے ڈھیر پر رفتہ رفتہ بچوں نے فضاؤں میں غوطے لگانے سیکھ لیے۔۔زینت کی سوچ نے بھی کئی زقندیں بھریں۔اُڑان جانے کہاں تک پہنچی لیکن وجود وہیں غلیظ کوٹھڑی میں گھسٹتا رہا۔۔۔جانے کتنا عرصہ بیتا۔۔بیتا بھی یا نہیں۔۔۔؟

گھونسلہ خالی ہو گیا۔۔۔ہوا کے زور سے تنکے اِدھر اُدھر لٹکنے لگے اور آخر بکھر گئے۔زینت بے طرح رونے لگی۔اس کے لیے وقت ٹھہر سا گیا تھا۔۔کوٹھڑی کی تاریکی بڑھنے لگی تھی۔۔۔

اس نے اپنے مایوس ذہن کو اپنے جسم کو موت کی شدید خواہش سے پرے دھکیلنا

شروع کیا۔وہ تو ہمیشہ ہی سے باغی تھی۔جانتی تھی کہ اس کے دشمن اسے قید میں رکھ کر ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر کے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔۔۔زینت ٹوٹنا نہیں چاہتی تھی۔اس نے اُمید کے دھاگے سے خود کو اندر سے سینا شروع کر دیا۔۔۔ماضی اور حال کے ٹکڑے جوڑنے لگی۔

دشمنوں کے خلاف نبرد آزما۔۔۔اس نے خود سے ملاقات کی ٹھان لی۔زمانے گزرے خود سے بچھڑے ہوئے۔اس کا اصل چہرہ کیا تھا۔اس کے خواب، آرزوئیں، خواہشیں کیا تھیں؟ وہ سب بھول چکی تھی۔۔۔اس نے دل و دماغ کے تہہ خانوں کے زنگ آلود دروازے کھولے۔۔۔یادداشت کی سیڑھیاں اُترنے لگی۔گھپ اندھیرا تھا۔ہر طرف کالی سڑاند تھی۔۔۔جالے تنے تھے، لیکن وہ بڑھتی گئی۔۔۔اندر ہی اندر۔۔۔۔زینہ بہ زینہ کوٹھڑی کی دیواریں اس کے بچپن کے دکھوں، جوانی کی گھاتوں، محبت کے زخموں کی ٹیڑھی میڑھی تصویروں سے اٹنے لگیں۔بچے کھچے کھانوں، منت سماجت سے مانگے گئے کوئلوں اور چاکوں کی مدد سے رنگا ہوا سیل اہرامِ مصر روپ دھار گیا۔

زینت ان تصویروں، اِن بگڑی اشکال کے الجھاؤ میں قید ہو کر رہ گئی۔۔۔سورج، گھونسلہ سب اُسے بھول گئے۔حتیٰ کہ ایک دن جیلر نے اس کی ذات میں کھلنے والے اس دریچے کو بھی بند کرنے کا حکم دے دیا۔ناک کے آگے رومال رکھے رکھے Cell کی تجریدی دیواروں کو غور سے دیکھا۔ان پر کالا رنگ پھیرنے کا فوری حکم صادر کر کے وہ عجلت میں وہاں سے نکل گیا۔۔۔شاید ان آڑی ترچھی لکیروں سے زندان کی مضبوط دیواریں تڑخنے کا خدشہ تھا!

زینت۔۔۔اپنے ماضی اپنے خوابوں کی بربادی پر کئی دن خاموشی سے ماتم

کناں رہی۔۔۔احتجاجاً۔۔۔کئی دن کی بھوک ہڑتال۔۔۔کے بعد اپنا ہی نقصان کرنے کے بعد۔۔۔اچانک اسے محسوس ہوا کہ سورج کی کرنیں کھڑکی پر چپکی اسے اپنی جانب بلا رہی ہیں۔۔گھونسلے کا نام ونشان بھی مٹ چکا تھا۔۔۔باہر کوڑے کا ڈھیر۔۔۔بلیوں، کتوں اور کیڑے مکوڑوں سمیت اسی طرح موجود تھا۔۔۔

زینت کو یک دم اپنے گھونسلے کی یاد ستانے لگی۔۔زندگی کے صحن میں بکھرا کوڑا کرکٹ نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔

اس کا شوہر زندگی کے دس برس اس کے ساتھ گزارنے کے بعد اچانک ہی قتل ہو گیا۔۔۔قاتلہ وہ تھی۔۔۔اس کی بیوی زینت بیگم!

عدالت میں اس نے یہی سنا تھا! اس پر ہی الزام لگایا گیا تھا، ملک اسلم نیم سیاسی زمیندار جس سے زینت کی شادی۔۔۔دونوں جانب سے برادریوں سے بغاوت تھی۔۔اور بغاوت کا انجام موت اور تحقیر کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ اسلم کا چھوٹا بھائی اکرم اپنی سالی کو۔۔۔اسلم کی گھر والی بنا کر اپنا شملہ اُونچا کرنا چاہتا تھا۔۔سسرال میں زینت کی گود ہری نہ ہوسکی۔۔۔سو ملک اسلم کی محبت اور زینت دونوں ہی مرجھانے لگے،

پھر ایک رات ملک اسلم زینت کی موجودگی میں اپنے کمرے میں قتل ہو گیا۔۔شواہد، گولیاں، ثبوت بھی کہتے تھے کہ قتل زینت نے کیا ہے۔۔۔

''ہاں شاید لوگ ٹھیک کہتے ہیں'' پرانی یاد کی تائید میں وہ بڑبڑائی۔۔۔۔''میں چاہتی تو اسے بچا سکتی تھی لیکن قاتلوں کا ہاتھ نہ روک سکی۔ وہ اللہ وسایا مُصلّی اور اس کے ساتھی تھے۔ شاید اسی لیے کیوں کہ اللہ وسایا کی بہن کے ساتھ ملک اسلم کو۔۔۔ اپنے شوہر کو میں نے خود برہنہ اپنے بستر پر دیکھا تھا۔ تو پھر میں اسے کیوں

بچاتی۔۔۔؟''

زینت نے کھڑکی کی سلاخوں سے سر ٹیکتے ہوئے خود سے جرح کی؟

''قاتلوں کا نام اور وجہ قتل بتا دیتی تو ملک اسلم رُسوا ہو جاتا۔ میری محبت رُسوا ہو جاتی۔ ویسے بھی سر کے سائیں کی زندگی میں بھی حویلی میں بھی قید ہی تھی''۔

اس نے سلاخوں سے سر ہٹا کر سورج کی کرنوں کو دیکھا، دُور تک پھیلی کائی زدہ دیواروں کی مہیب خاموشی کو سنا۔ ہوا سے بکھرتے چند کاغذوں اور پتوں کی بے بسی کو جانچا۔

''اکرم چاہتا تھا کہ میں قتل کے الزام میں اندر ہو جاؤں۔ اللہ وسایا کو اُسی نے بھڑکا کر بھیجا تھا، اس کے منہ کو خون لگ چکا تھا اس نے ایک تیر سے کئی شکار کیے، لیکن میں مروں گی نہیں''، وہ بڑبڑائی۔

آنکھوں میں ساری سموئی وحشت سمیت اس نے ایک چیل کو پلک جھپکتے میں کوڑے پر دوڑتے ایک چوہے کو جھپٹا مار کر دبوچتے دیکھا۔ ایک بار باہر نکل جاؤں۔ ملک اکرم کا گناہ اس کے منہ پر لیپ دوں گی۔ وہ سوچتے سوچتے پاؤں پر چلتے کیڑے کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ ملک اسلم کی یاد کے ساتھ ہی اس کے سنگ گزارے لمحوں کا گداز رگ و پے میں سرسرانے لگا۔ وہ رونے لگی، اپنی بیوگی پر۔۔۔اپنے اُجڑنے پر۔۔۔دھیرے دھیرے پھر اونچے سروں میں، سسکیاں ہوکوں میں ڈھلنے لگیں۔۔۔سورج کی کرنیں کھڑکی کے درمیانی حصے تک پہنچ کر رُخ بدل گئیں۔ منظر نامہ تاریک ہو گیا۔ زینت جانے کتنی صدیوں بعد دل کھول کر روئی اور آنکھیں موند کر سوئی۔۔۔

آنکھ کھلی تو کرنیں کھڑکی سے لپٹی اسے حیرت سے تک رہی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا

تھا کہ کرنیں اس کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھیں۔۔۔کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔

''اٹھ۔۔۔تیری طلبی ہے۔۔۔''

وہ حیرت زدہ سی لڑکھڑاتی ہوئی زنداں سے نکلی۔۔۔کرنوں نے گڑبڑا کر راستہ بدل لیا۔

زینت چلنا بھول گئی تھی۔گارڈوں کی طنزیہ مسکراہٹ نے اسے ٹھوکا دیا۔اس کی باغی روح نے سنبھالا دیا۔۔۔اس کی چال متوازن ہونے لگی۔۔۔کال کوٹھڑی اسے مار نہیں سکی تھی نہ پاگل کر سکی تھی۔۔۔بلکہ زینت کی خود سے ملاقاتیں شروع ہو گئی تھیں۔۔اور یہی زینت کی جیت تھی۔

نئی حکومت نے ووٹ جیتنے کی خاطر۔۔۔قیدِ تنہائی کی سزائیں ختم کر دی تھیں۔۔۔زینت بھی عام بیرکوں میں شفٹ ہو گئی تھی۔۔۔پہلے تو وہ بدکی ہوئی گائے کی طرح دُور کھڑی۔۔۔قیدی عورتوں کو۔۔اس ہجوم کو دیکھتی رہی۔۔۔جو الگ الگ بھی تھیں۔۔۔اور ایک لہر کی مانند مدغم بھی۔۔۔آخر اس نے بھی اس دریا میں چھلانگ لگا دی۔

اس کے جسم کو روشنی، ہوا اور حرکت سے محروم رکھ کر بھی اس کی روح کو وہ نہیں زنجیر کر سکے تھے۔

وہ اپنی جیت کا جشن منانا چاہتی تھی۔۔۔ناچنا گانا جھومنا چاہتی تھی، مگر اس کا جسم اس کی روح خوشیوں سے باغی ہو چکے تھے۔۔۔سیلن زدہ پتھروں اور کائی زدہ دیواروں نے گزشتہ پانچ سالوں کے دوران صرف بین بھر دیے تھے اسے کے اندر۔۔۔

سو وہ برآمدوں میں۔۔بیرکوں۔۔۔اچانک ہی کسی وجہ کے بغیر اچانک پھوٹ

پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی۔۔اور بھی کئی کاندھے۔۔۔کئی سینے۔۔۔اس کا سر اس کے آنسو اپنے اندر سمیٹنے کو تیار ہوتے۔۔دھیرے دھیرے زینت کے اندر کے بین باہر بہنے لگے۔۔کائی اور سیلن چھٹنے لگی۔۔اب وہ مسکراتی بھی تھی۔۔کبھی لڑتی جھگڑتی بھی تھی۔۔۔کبھی کبھار کوئی ادھورا جملہ۔۔۔کوئی ادھوری بات کرتی اور پھر چپ ہو جاتی۔۔۔گھنٹوں، دنوں خاموش رہتی۔۔۔کوئی اسے تنگ نہ کرتا کہ۔۔۔سبھی کا درد مشترک تھا۔۔۔قید، دکھ اپنوں سے دوری۔۔۔وہ سب اس مثلث کے کونوں میں بندھی۔۔۔ایک دوسری سے جڑی ہوتی تھیں۔۔۔

ایک دن اچانک ہی زینت نے غل غپاڑہ کیا۔۔۔شور، اونچی صلواتیں کوسنے، گالیاں۔۔جو من میں آیا بکتی چلی گئی۔۔یہاں تک کہ پسینہ اس کی ایڑیوں سے بہہ نکلا۔۔منہ سے جھاگ رواں ہو گئی۔۔۔اور وہ تھک ہار کر برآمدے کے فرش پر چت لیٹ گئی۔۔شاید آخری زوردار ریلا تھا۔۔۔برسوں کی بھڑاس کا۔۔۔

کسی نے اسے نہ چھیڑا۔۔وہ رات گئے تک وہیں چت لیٹی چھت کو تکتی رہی۔۔خاموش بے جان۔۔۔

اور پھر خاموشی سے اُٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔۔۔اگلی صبح ایک نئی زینت نے جنم لیا۔۔۔

اس نے ہنسنا کھیلنا شروع کر دیا۔۔۔شور شرابہ، کام کاج۔۔۔گپ شپ۔۔۔شاید خوف کو بھگانے کا یہ نیا انداز تھا۔۔۔وہ خوف جو اس کی تمام تر طاقت کے باوجود زنداں کی دیواروں سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔۔۔اب اسے آزادی کی اُمید بندھ چلی تھی۔۔۔وہ جان گئی تھی کہ زندان سے بیرک تک کا سفر۔۔۔کسی دن جیل کی دیواروں سے باہر کی منزل پر بھی ختم ہو سکتا ہے۔۔۔شاید

اس پر آشکار ہو چکا تھا کہ سب سے بڑی طاقت خواہش ہے۔۔زندہ رہنے کی خواہش۔۔۔جو اس کے اندر۔۔چڑیا کے گھونسلے، سورج کی کرنوں۔۔۔چاک کوئلے کی بنی اشکال نے مرنے نہیں دی۔

یہ خواہش اب اس کے اندر اُبل رہی تھی۔۔طاقت بن کر اس کے وجود کو لتاڑ رہی تھی۔۔زینت نے اس خواہش کو اپنی طاقت بنا لیا اس کا بے دریغ استعمال کرنے لگی۔۔خود کو منوانے لگی۔۔۔کسی روایت، کسی اصول، کسی ضابطے کی قیدی بن کر رہنے سے انکاری ہو گئی۔

دو بار اس کی رہائی کی تاریخ مقرر کی گئی۔۔مگر اس کے خلاف رپورٹس کے باعث cancel کر دی گئی۔۔۔

زینت کو فی الوقت شاید رہائی سے زیادہ خود کو منوانے کی خواہش نے پاگل کر رکھا تھا۔۔۔وہ اپنے ذہن کو اپنی مرضی سے اپنے خوابوں سے سجا رہی تھی۔۔۔تصویریں نقش بنتے تھے۔۔بگڑتے تھے۔۔متحرک تصویریں اس کی سوچوں کو زندہ رکھتی تھیں۔۔۔وہ اب انھی تصویروں اور سوچوں کے ساتھ Live کرنا سیکھ گئی تھی۔۔۔اس حد تک کہ آنکھیں کھولتی تو چونک جاتی، لگتا کسی سکرین سے نظریں ہٹ گئی ہوں۔۔۔کوئی کہانی ادھوری رہ گئی ہو۔۔۔

پھر اچانک ہی وہ خاموش ہو کر بیرک کی دیواروں سے لگ کر بیٹھ گئی۔۔۔کئی دن۔۔۔یونہی خاموش۔۔۔ویران۔۔۔اسے احساس ہونے لگا کہ آزادی کا تعلق نہ دیواروں سے ہے نہ ہتھیاروں سے۔۔۔آزادی نہ کوئی ڈش ہے نہ کتاب۔۔۔بس ایک طاقت ہے جو جینا بھی سکھاتی ہے اور مرنا بھی۔۔۔مگر اپنی مرضی سے۔۔۔یہ سوچتے سوچتے اس کے چہرے پر ایک رات بے حد معصوم بے

خوف اور پراسرار سی مسکراہٹ اُبھری۔۔۔ایک ایسی مسکراہٹ جس کا تعلق ہونٹوں یا چہرے کے عضلات کے پھیلنے سے نہیں تھا۔۔۔زینت کے پورے وجود سے تھا اس کا پورا وجود مسکرا رہا تھا۔۔۔بے خوف۔۔۔پراسرار اور ایک طنزیہ مسکراہٹ۔۔۔

اگلی صبح وہ آزاد ہو چکی تھی۔۔۔ہمیشہ کے لیے۔۔۔بیرک کی دیوار سے ٹیک لگائے لگائے۔۔۔کسی جیلر۔۔کسی سپرنٹنڈنٹ۔۔کسی حکومت کے حکم کے بغیر۔۔۔اپنی مرضی سے۔۔۔اپنی خواہش سمیت۔۔ایک گھونسلے سے کسی دوسرے گھونسلے کی جانب پرواز کر چکی تھی۔۔۔!

☆☆☆

لڑم

لڑم۔۔اُس کی بھاری آواز کی بازگشت پراسرارتھی

''لڑم۔۔۔میرا نام لڑم ہے''

بھاری بھرکم چادراوڑھے۔۔۔کسی حدتک خمیدہ کمر والے لڑم کا جُثہ دُبلا پتلا مگر چوکس نظرآرہا تھا، سُرمئی بادلوں جیسے گھنے بالوں کی ٹوکری اُٹھائے سر کو گھما کر اُس نے مسافر کی جانب دیکھا

مسافر کے چہرے پر بکھرے تجسس اور خوف نے لڑم کے کھردرے باریک ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ سجادی، عقاب کی چونچ سے مشابہ ناک کے لمبے اور کھلے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے، اُس نے الائچی کی خوشبو بکھیرتے قہوے کے دو کپ مسافر کے سامنے رکھی پستہ قامت لنگڑی میز نما چوکی پر رکھ دیئے، جس کی ایک ٹانگ کو دو تین اینٹوں نے سہارا دے رکھا تھا اور پُشت مسلسل رگڑنے کے بعد جگہ جگہ سے اُدھڑ چلی تھی۔

لڑم نے سُرمئی بادلوں کے ٹوکرے کو تھوڑا دائیں جانب لڑھکایا، چادر کے جھالر والے سروں کو گول کر کہ گود میں رکھتے ہوئے وہ چوکڑی جما کر موڑھے پر بیٹھ گیا۔ مسافر نے ایسا نمدہ اپنی نانی کے باورچی خانے میں دیکھا تھا۔ بھیڑ کی کھال پر کاتے

دھاگے سے بنا ہوا وہ نمدہ شیر اور بکری کی تصویروں کے علاوہ جا بجا رنگین پھولوں سے مزین تھا۔

اچانک مسافر کو نانی کی شال کی مہک محسوس ہوئی جس میں اکثر ماں کی ڈانٹ سے بچنے کی خاطر چھُپ جایا کرتا تھا، خوف نے اُسکے اندر چادر تان دی۔ یونہی وہم سا ہونے لگا، اُس نے سُن رکھا تھا مرنے والے اپنے کسی پیارے کی آمد کا سُنتے ہی اسکے قریب آجاتے ہیں، اچانک ہی دور افتادہ پہاڑی کی چوٹی پر شدید بارش میں کار کا خراب ہو جانا، لڑم سے ٹکراؤ اُس پر طُرہ یہ کہ اسکی باتیں اور حُلیہ۔۔۔نانی کی شال کی خوشبو جو بچپن میں حوصلہ دیتی تھی اب ڈرانے لگی تھی۔

بھاری پپوٹوں اور گھنی بھوؤں میں دھنسی چمکیلی آنکھیں مسافر پر گاڑھتے ہوئے لڑم نے پوچھا

''تُم کانپ کیوں رہے ہو؟''

مردانگی پر ضرب لگتے دیکھ کر لہجے کو مزید ٹھہرا کر کہا

''یہاں سردی بہت ہے''

''لڑم نے ایک بلند آہنگ قہقہہ بلند کیا، مسافر کو لگا جیسے بہت ساری چمگادڑیں پھڑ پھڑا رہی ہوں، اس نے بے اختیار چھت کی جانب دیکھا جو اسکی بے بسی سے دو ڈھائی فُٹ ہی اونچی ہوگی، کیونکہ داخل ہوتے واقت اسے اور لڑم کو خاصا سر جھکا کر اندر آنا پڑا تھا، وہ کُٹیا جو تھوڑی دیر پہلے گوشۂ عافیت محسوس ہو رہی تھی اب زنداں سے کم نہیں لگ رہی تھی، جانے کب طوفان تھمے گا اور اسکی خلاصی ہوگی۔

دور جنگل میں بسنے والے لڑم کی حسیات بھی جنگلی جانور کی سی تھیں۔ اُس نے مسافر کے خیالات کو جیسے سونگھ لیا، ''یہ پہاڑی طوفان ہے من موجی، چاہے تو ابھی تھم

جائے ، نہ تھمے تو ہفتوں نہ تھمے'' مسافر کے معدے سے اُٹھنے والا گولہ حلق میں آن پہنچا۔

''لو قہوہ پی لو گرم گرم ۔۔اندر تک کی برف پگھل جائے گی''

لڑم کے معنی خیز جملے اور قہقے سے پستہ قامت لنگڑی میز لرزنے لگی مسافر نے جلدی سے قہوے کی پیالی مُنہ سے لگالی ،لڑم کسی ماہر جراح کی طرح اس کا ہر زخم ٹٹول رہا تھا۔

''لڑم کا مطلب جانتے ہو؟''

مسافر نے ایک مجبور و بے بس مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا جیسے امتحانی پرچے کا ایک بھی سوال نہ حل کر سکتا ہو۔

''بچھو'' لڑم پُھنکارا

مسافر بدک کر کھڑا ہو گیا۔قہوے کی پیالی اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر نمدے پر اوندھی گر گئی۔

وہ غیر ارادی طور پر ارد گرد دیکھتے ہوئے اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

''میرے نام کا مطلب بچھو ہے، اتنے بڑے بچھو کی کھولی میں دوسرا بچھو کیسے آئے گا۔۔ہاہاہا''

''اوہ'' مسافر کی اُکھڑی ہوئی سانس دوبارہ پھیپھڑوں کا رُخ کر گئی ''عجیب سا نام ہے'' وہ بُڑ بڑایا

''ہاں ہے تو سہی پر لوگوں نے رکھ دیا میں نے مان لیا''

لڑم نے سُرمئی بالوں کی ٹوکری کو بچھو کے ڈنگ جیسی ،رنگین نگوں والی چاندی کی انگوٹھیوں سے لدی انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا، مسافر کو لگا اسکے بالوں میں کوئی بچھو

چل رہا ہے، بچا ہوا قہوہ ابھی تک لکڑیوں کی ہلکی ہلکی آنچ پر ابل ابل کر لڑم کی جھونپڑی کو اپنی مہک سے لبریز کئے جا رہا تھا، جانے مہک سلگن سے ہی کیوں جُڑی ہے، مسافر سوچے بنا نہ رہ سکا

''ایسا نام کیوں رکھا تمہارے ماں باپ نے؟''

''ماں باپ نے؟ ہاہاہا'' اسی گاؤں کی گلیوں میں ہوش سنبھالا۔۔ماں باپ کون تھے کہاں چلے گئے کچھ نہیں معلوم۔۔لوگوں نے لڑم لڑم پکارنا شروع کر دیا''

اب مساف کے اندر اُبلتے خوف پر تجسس کی بالائی جم رہی تھی ''ایسا کیوں؟ تم کیا تنگ کرتے ہو لوگوں کو؟''

لڑم نے اُلٹا جواب داغ دیا

''تُم نے اتنی رات گئے اس پہاڑی پر آنے کی کوشش کیوں کی۔۔شُکر کرو میں نزدیک تھا ورنہ میرے کُتے تمہاری ہڈیاں بھی نہ چھوڑتے''

لڑم کی چمکدار آنکھیں لحظہ بھر کو خنجر کی دھار جیسی دکھائی دیں۔مسافر کی ریڑھ کی ہڈی میں برف سی جم گئی۔۔''تُم نے میرے کتوں کو صرف بھونکتے سُنا ہے نا۔۔میرے ساتھ آتے ہوئے۔۔صبح دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے''

مسافر نے بمشکل پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا

''کسی خاص نسل کے ہیں؟''

''کتوں کی کوئی نسل نہیں ہوتی۔۔جیسے انسانوں کی کوئی نسل نہیں ہوتی۔۔۔سب ڈرامے بازیاں ہیں۔۔'' وہ لکڑی سے بُجھتے ہوئے کوئلوں کی راکھ کو کریدنے لگا، مسافر دم سادھے سُن رہا تھا

''انسان کُتے ۔۔۔سبھی جانور بس دو قوتوں کے اشارے پر چلتے ہیں۔۔۔

رحمان یا شیطان ۔ ۔ ۔ یہ نسل وسل سب بکواس ہے'' لمحہ بھر کو آگ کی لپٹیں اسکی آنکھوں میں اُتر آئیں۔

''جانتے ہوئے یہ سب کُتے آوارہ ہیں۔۔۔گلی کے کُتے ۔۔بس دو وقت کی روٹی کے بدلے میرے اشاروں پر جان دیتے ہیں ۔۔۔اوپر اللہ نیچے لڑم اور اسکے کُتے ۔۔ہاہاہاہا۔۔''

مسافر کو پہلی بار محسوس ہوا لڑم کے قہقہوں میں چیخیں دفن ہیں۔۔اَن سُنی چیخیں ۔۔اَن سُنے بین اور سسکیاں۔۔۔جانے کیوں اسکے دل ودماغ میں جسم پر چڑھی کپکپی عجب سی نرماہٹ میں بدلنے لگی۔

''لڑم'' اُس نے پہلی بار اسکا نام پکارا لڑم نے چونک کر دیکھا پھر مُسکرایا۔۔۔جیسے اسکے اندر کی تبدیلی کو بھانپ چکا ہو۔

''تُم اکیلے یہاں؟ کب سے؟''

''جب سے یہ چاند تارے ہیں یہاں ۔۔۔جب سے اس پہاڑی نے جنم لیا تھا۔۔''

''تُم بھوت تو نہیں ہو؟'' مسافر پہلی بار کُھل کر مسکرایا

''شاید آبادیوں کے بھوتوں سے کم خطرناک''

دونوں کے درمیان جما گلیشیئر دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔۔۔قہوے کا دور چلتا رہا۔۔مسافر اونگھتا سنبھلتا رہا۔۔۔حتیٰ کہ ستاروں نے شفاف آسمان سے رخت سفر باندھا کہ بادل کُھل کر برس چکے تھے، دونوں نے انگڑائی لی۔۔ اور کمر جھکا کر باری باری جھونپڑے سے باہر نکل آئے۔۔۔ابھی سورج اپنا سہرا ہٹانے کی تیاری میں تھا ۔۔ چاروں جانب صاف شفاف آسمان دُور دُور تک دھلا سبزہ۔۔۔ایسا منظر ترقی

یافتہ شہروں میں کہاں؟۔۔مسافر نے صبح کی نم آلود تازہ ہوا اندر اُتاری کپکپی کے ساتھ ایک نیا خوشگوار احساس اسکے رگ وپے میں اُتر گیا۔

تبھی لڑم کے کتوں کی بھونک نے اُسے کسی تصویر کے کینوس سے باہر لا پھینکا ۔۔۔لڑم کی جھونپڑی کی جانب آنے والی پتھروں سے بنی سیڑھیوں پر بے شمار کُتے موجود تھے۔۔۔اور لڑم انہیں کھانا کھلا رہا تھا۔۔لڑم کے چہرے پر مامتا کا نور تھا اور کُتے اسکے گرداگرد یوں کھڑے تھے جیسے مُرشد کے حضور مُرید۔

مسافر دلچسپی سے اس منظر کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔۔ ہر رنگ ۔۔ ہر قامت ہر شکل کا کُتا تھا وہاں۔۔لنگڑے۔۔کنکٹے کُتے ۔۔خارش زدہ۔۔کانے۔۔مگر تھے سب گلی کے کُتے ۔۔۔یہ قدر مشترک تھی ان میں یا پھر لڑم ۔۔۔ان سب کا مشترک مسیحا!! لڑم کا کردار مسافر کے لیے ایک نیا جنم لے رہا تھا۔۔۔تبھی لڑم کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔۔۔

''تُم تو پہلے ہی راستہ بھولے ہوئے ہو۔۔اب کہاں بھٹک گے؟''

''لڑم تُم ہو کون؟، کیسے میرے اندر جھانک لیتے ہو؟'' مسافر حیرتوں میں ڈوب کر پکارا

''میں فطرت کی گود میں پلا ہوں۔۔اسکی سرگوشیاں سُن لیتا ہوں''

وہ اسکی جانب آتے ہوئے بولا۔۔۔اسکے ہاتھ میں دو خالی بالٹیاں تھیں ۔۔ سارا کھانا کُتے کھا چکے تھے ۔۔ کچھ کتوں نے مسافر کی جانب دیکھ کر کان کھڑے کیے۔۔۔کچھ نے دانت نکو سے ایک بھونکا بھی لیکن ایک خاص فاصلے سے وہ آگے نہ بڑھے۔

لڑم اب مسافر کے قریب آ چکا تھا۔۔''دیکھا۔۔یہ گلی کے کُتے ۔۔ مہذب

بستیوں کے انسانوں سے زیادہ تمیز دار ہیں''

واقعیٰ ہی مسافر نے نوٹ کیا کہ انہوں نے کسی چھینا جھپٹی کے بغیر سکوں کے ساتھ کھایا تھا

مسافر اب با آوازِ بلند بولا ''لڑم تُم کون ہو؟، کیا ہے تمہاری اصلیت ۔۔ یہ سب کچھ بہت عجیب سا ہے ۔۔ بہت ہی مختلف''

لڑم نے سکون کے ساتھ بالٹیاں اپنی جگہ پر رکھیں ۔۔ پاس پڑے ڈرم سے ہاتھ دھونے کے بعد گویا ہوا ۔۔

''چاہو تو ناشتہ مل سکتا ہے ۔۔ خالص گھی کے پراٹھے اور بکری کے دودھ کی چائے ۔۔''

مسافر نے دُہرایا ۔۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں لڑم''

لڑم نے نرم سی سنجیدگی کے ساتھ چادر سے ہاتھ خُشک کرتے ہوئے ۔۔ اپنے کُتوں پر نظر ڈالی اور فقط اتنا کہا

''میں انسان ہوں ۔۔۔ فطری انسان ۔۔ خالص زندہ انسان ۔۔ تمہاری بستوں میں اب زندہ لاشیں موجود ہیں''

یہ کہہ کر لڑم نے مسافر کی جانب پیٹھ موڑتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کمر جھکا کر اپنے جھونپڑے میں داخل ہو گیا ۔۔ مسافر نے دور تک بل کھاتی پتھر کی سیڑھیوں کو دیکھا ۔۔ جن پر سے اُسے اُتر کر گاڑی تک پہنچنا تھا ۔۔ مگر مسافر کو یقین تھا کہ لڑم کے کُتے اُسے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

☆☆☆

دل دروازے

ہمیشہ کی طرح اس نے چند دن پہلے پہنچ کر اس چھوٹے سے لگژری فلیٹ کی صفائی کی۔ چیزیں ترتیب سے رکھیں، بیڈز کی چادریں بدلیں، سیٹنگ کو نیا انداز دیا، گلدانوں میں تازہ پھول سجائے۔ اس سارے عمل میں اسے تین چار دن لگا کرتے تھے۔ وہ دو دن میں بہت ساری ڈشز بنا کر فریزر میں رکھ لیتی تھی تا کہ آنے والے لمحوں کو قطرہ قطرہ کشید کر کے یادوں کی جھیل میں جمع کر سکے اور جب وہاں آنسوؤں کے کنول کھلیں تو یادوں کی لہریں اُنھیں بہلا سکیں، جھلا سکیں۔

ویسے بھی ہر کام بڑے سلیقے اور سبھاؤ سے کرنے کی عادی تھی۔ اسے عین ٹائم پر ہڑبونگ سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنا ایک Target Time رکھتی جو ہمیشہ اصل وقت سے چند گھنٹے پہلے ختم ہوتا تھا۔

کسی بھی تقریب میں وہ ہمیشہ پانچ منٹ پہلے اپنی گاڑی پارک کر رہی ہوتی۔ اسے دیکھ کر ساتھی اپنی گھڑیاں ٹھیک کیا کرتے تھے۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ سب کام مکمل تھے۔ بس اب اسے ان دونوں کا انتظار تھا، جو اس کی روح میں رچے بسے تھے ۔۔۔

بڑے کے کمرے کی ہر چیز بلیو رنگ کی ہوتی تھی کہ وہ بہت نفاست پسند تھا۔

سلیقے سے کپڑے، پرفیومز لگانے اور بالوں کو دن میں کئی کئی بار سنوارنے والا۔ چھوٹا تو ہمیشہ ہی سے تھوڑا لا پرواہ تھا۔ آرٹسٹ جو ٹھہرا۔ جانے کہاں کہاں سے کتابیں ڈھونڈ کر لاتا۔ کہانیاں سناتا اور تصور ہی میں خود کو ان کا کردار بنا لیتا ہے۔ اسے شوخ رنگ پسند تھے۔ شرارتی آنکھوں والے چھوٹے کی مسکراہٹ پر وہ جان دیتی تھی۔ بڑے کی آنکھوں کی سنجیدگی اور ہلکی ہلکی میسنی ہنسی کی وہ عاشق تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سارے گھر کا جائزہ لیا، سب کچھ ٹھیک تھا، بس کمی تھی تو ان دونوں کی جو شام سات بجے پہنچنے والے تھے۔

پچھلے پانچ سال سے یہ ان تینوں کی Routine تھی۔ ماما اپنے کاموں میں بہت الجھ گئی تھی۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے موم بتی کو دونوں سروں سے جلانا شروع کر رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنے Professionals میں تھے۔ ہوسٹلوں میں زندگی کے میلے میں مگن اور مست!

ماما خوش تھی کہ وہ خوش تھے، آسودہ تھے۔ یہ چھوٹا سا فلیٹ اس نے بہ شوق خریدا تھا، جس کے سامنے بے کنار سمندر تھا۔ کف اُڑاتی لہریں تھیں اور بپھری ہوئی ہوا۔ کبھی کبھی تو ماما کو یوں لگتا جیسے یہ فلیٹ اس کی اپنی زندگی کا Symbol ہے۔ وقت اور حالات کے سمندر کے سامنے سینہ سپر ایک چیلنج کی طرح۔۔۔ ایک چیلنج کے لیے۔۔۔ اک چیلنج کے سامنے!

چھ بج رہے تھے۔ اسے بس نہانا تھا اب۔ نہا کر اس نے اپنا ہاؤس گاؤن پہنا اور چھوٹے چھوٹے بالوں میں پنیں اڑس کر بکھرا بکھرا سا جوڑا بنا لیا کہ وہ دونوں اسے اس انداز میں بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے لیے ان کی ماں ایک آئیڈیل عورت تھی۔

رنگ اکٹھے ہوئے، ایک تصویر بنی، وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ جوش سے تمتماتے چہرے لیے وہ دونوں اپنی اپنی کہانیاں۔۔۔ اپنے معرکے ماں کو سنا رہے تھے۔ مالن اپنے سینچے ہوئے پودوں کی اُٹھان دیکھ رہی تھی۔ پھولوں کے تمام رنگ اس کے چہرے پر سجے ہوئے تھے۔ تصویر زندہ ہو گئی تھی۔

ماما نے قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا ''آج میں بھی ایک کہانی سناؤں گی''

چھوٹا چلایا ''wow آپ ہمیشہ بہت اچھی کہانیاں سناتی ہیں''

نہیں، یہ کہانی بہت مختلف ہے۔ نہ اچھی، نہ بری۔ بس ایک کہانی ہے۔ تم سننے کے بعد رائے دینا کہ اس کا انجام بھی تم دونوں ہی تجویز کرو گے'' اس کا لہجہ گھمبیر تھا۔

''ہم۔۔۔ مگر وہ کیسے؟'' دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا کہ دل میں اترنے والا وہی راستہ تھا۔

وہ مسکرائی ''یہ تمہیں سوچنا ہے کہ کیسے؟''

کہتے ہیں زندگی کی شام نظر آنے لگے تو اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔ ماما نے قہوے کی تلخی کو اپنے اندر انڈیلتے ہوئے کہا ''لیکن میں آج صرف وہ باتیں کروں گی جو میں سوچتی ہوں۔ وہ کہانی سناؤں گی جس کہانی نے مجھے سوچا تھا''

لڑکوں کی نظریں پھر ایک مرتبہ ملیں۔ وہ زینہ بہ زینہ اترنے لگے تھے۔ اندر کہیں دور۔۔۔ ایک دسرے میں ''چیزوں کے ٹوٹنے سے کرچیاں بکھرتی ہیں۔ خواب ٹوٹتے ہیں تو ان کا ملبہ اندر ہی کہیں گرتا رہتا ہے۔ دھیرے دھیرے دیواروں کو کھانے لگتا ہے اور پھر دیواریں بھی ملبہ بن کر ڈھے جاتی ہیں''

ماما کی نظریں کسی دیوار کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

مجھے تمام عمر ٹکڑوں میں بٹے لوگ اور ٹکڑوں میں بٹی محبتیں ملیں۔ ہر شخص بہت

سے چہرے لیے گھوم رہا تھا۔ کچھ اصلی کچھ نقلی، میرے پاس تو ایک ہی چہرہ تھا، اچھا تھا یا برا، میرا اپنا چہرہ تو تھا۔ ماسک پہننے والوں نے اپنے تیز ناخنوں سے اسے نوچنا چاہا۔ مسخ کرنا چاہا۔ بہت خراشیں آئیں۔ بہت چوٹیں لگیں لیکن دیکھا تم نے کہ یہ آج بھی سلامت ہے۔'' ماما نے چند گھونٹ پانی پیا۔

''سقراط نے تو زہر کا پیالہ ایک ہی بار پی لیا اور سکھی ہو گیا۔ جانتے ہو۔۔ میں نے قطرہ قطرہ زہر پیا ہے۔ ہر لمحہ مرتی رہی ہوں۔ میں تو بتوں کے شہر میں تھی۔ سب ادھورے تھے ٹوٹے ہوئے نامکمل بت۔ کسی کے ہاتھ نہ تھے تو کسی کے پاؤں نہ تھے، کسی کا کان دریدہ تھا تو کسی کے ہونٹ جھڑ چکے تھے، آنکھیں تو شاید سبھی کی پتھر کی تھیں۔ پھر ایک بت میں نے خود تراشا۔ اس کے تمام اعضا سالم تھے مگر جانتے ہو کیا ہوا؟ ایک غلطی ہو گئی مجھ سے، اس بت کے سینے میں دل رکھنا بھول گئی میں''

بڑے اور چھوٹے کے دل سے بھاری سے ہو گئے۔ انھوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ابھی پتھر نہیں ہوئے تھے۔

پھر ایک رات اس نے مجھے بت بنانا چاہا کہ وہ خود میری پوجا کرنا چاہتا تھا۔ میں بت میں ڈھل گئی کہ میں اپنی تکمیل کے لیے پاگل ہوئی جا رہی تھی لیکن وہ مجھے ایک گوشے میں سجا کر بھول گیا۔ بہت دنوں بعد لگا کہ میں تو بہت سے ٹکڑوں میں بٹنے لگی ہوں۔ ہواؤں کے تھپیڑے مجھے آہستہ آہستہ بھربھری ریت میں بدلنے لگے ہیں۔ میں ذرہ ذرہ بکھرنے لگی۔ خود کو سمیٹنے کے لیے۔

بکھر جانے کے خوف سے۔ دھول بن جانے کے خوف سے میں نے وہ گوشہ چھوڑ دیا۔ ماما کی آنکھوں میں ریت اڑنے لگی۔ میں اسے سنگ تراش سمجھی تھی۔ مگر وہ تو پتھر کوٹنے والا نکلا۔

چھوٹا ایک دم بولا'' مگر بت سنگ تراش کیسے بن گیا؟''

''میں نے بتایا تھا کہ اس بت کو بناتے وقت میں اس میں دل رکھنا بھول گئی تھی۔ دل کے بغیر جو بت ہوتے ہیں ان کا دماغ بہت کام کرتا ہے۔ بہت Genious ہوتے ہیں وہ۔۔۔ وہ سب کچھ بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر صرف اپنی خوشی کے لیے۔۔۔ اپنی مرضی سے۔۔۔''

چھوٹا اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود ماما کے اس فلسفے کو نہ سمجھ سکا اور اس نے اپنا سر یونہی تصدیق میں ہلا دیا'' ماما، اس کہانی کا کردار آپ خود ہیں کیا؟'' بڑے نے کھوجتی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''ہر اچھا کہانی کار۔۔۔ داستان گو۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پڑھنے والے، سننے والے سمجھتے ہیں کہ وہ اس کی اپنی کہانی ہے'' ماما نے دور کہیں کھڑکی سے باہر تاریک آسمان پر ٹوٹتے ہوئے ایک ستارے کو دیکھ کر کہا۔

''ماما میں تو ڈر سا گیا ہوں۔ آپ کا لہجہ اتنا اداس، اتنا خوفزدہ کر دینے والا ہے'' چھوٹا ابھی تک چھوٹا ہی تھا۔

''ہاں شاید ابھی یہ باتیں۔۔۔ یہ کہانیاں تمہارے سننے کی نہیں ہیں۔۔۔ یا شاید کبھی بھی نہیں۔ کیوں کہ تم دونوں مرد ہو۔ عورت کا بت تراش سکتے ہو۔ اس کے بدن کے ایک ایک زاویے کو تو اُبھار سکتے ہو۔ مگر اس کے دل کو کیسے بنانا ہے، کیسے تراشنا ہے، یہ تم کبھی نہ جان پاؤ گے'' ماما پھر داستان بن گئی۔

''مرد کو طوائف ملتی ہے تو اس میں بیوی ڈھونڈنے لگتا ہے۔ بیوی ملتی ہے تو طوائف کو تلاشتا ہے اس میں۔ دونوں بہروپ دھار لو تو وہ خوش ہوتا ہے۔ مگر عورت ماں بن جائے تو طوائف بننا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم یہ تو سمجھ رہے ہو نا؟''

''کچھ کچھ۔۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔ دونوں زینہ بہ زینہ ایک دوسرے کے دل تک پہنچ گئے تھے، مگر ابھی باہر ہی کھڑے تھے۔

''پھر مرد نئی دنیاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور میرے جیسی تکمیل کی خواہش لیے اپنی تلاش کے چکروں میں پڑی عورتیں اس ٹوٹے پھوٹے ادھورے سے مرد کو بھی کھو دیتی ہیں کیوں کہ مرد منزل پر تو ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے، سفر کے آغاز میں بھی ساتھ دے سکتا ہے، مگر عورت کی ذات کی تلاش کے سفر میں اس کے ساتھ قدم بہ قدم نہیں چل سکتا۔ وہ تو بس فاتح بن کر جلد از جلد اپنے نام کا جھنڈا گاڑنا چاہتا ہے۔۔۔ بت بنا کر۔۔ بت بن کر امر ہو جانے کا سوچتا ہے''

ماما کے ہاتھ میں قہوے کا پانچواں کپ تھا۔ بڑے نے آہستگی سے تھرموس اٹھا کر پرے رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ قہوہ پینے کے بعد ماما ساری رات جاگے گی۔ کھڑکی میں کھڑی رہے گی۔ بپھرے سمندر کو دیکھتے دیکھتے رات بتا دے گی۔ صبح سویرے تڑپتی لہروں کو سینے سے لگانے کو بھاگے گی۔ جب تھک جائے گی تو Sleeping Pills کھا کر سو جائے گی۔

بڑے کا دل بھر آیا۔ پانی آنکھوں کے راستے ٹپکنے لگا۔ چھوٹے کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''ماما رات بہت ہو گئی ہے۔ آپ اب سو جائیں''

''مگر میری کہانی تو ابھی ادھوری ہے۔ کہانی ختم ہو جائے گی تو سو جاؤں گی۔ اب تو سونا ہی ہے''

'باقی کہانی صبح سن لیں گے۔ ہمیں بھی نیند آ رہی ہے''

بڑے نے ماں کی کمزری کا سہارا لیا۔

''اچھا، ٹھیک ہے، نیند آ رہی ہے تو تم سو جاؤ'' ماما بھلا ان کی نیند کیوں کر خراب کر سکتی تھی۔

''نہیں، جب تک آپ اپنے کمرے میں جا کر سو نہیں جاتیں ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے''

دونوں نے متفقہ فیصلہ سنا دیا۔

''اچھا۔ تم کہتے ہو تو سو جاتی ہوں''۔ ماما نے جیسے نظروں ہی نظروں میں اپنا دل اُن پر وار دیا۔

دنوں نے ماں کو چوم کر شب بخیر کہا۔ اس نے دونوں کو اپنے ساتھ لپٹا کر ان کے زندہ دلوں کی دھڑکن کو سنا۔ اپنے بدن کے ان لوتھڑوں کی طاقت کو محسوس کیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ چادر اوڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح ہراساں چھوٹے نے بڑے کو جھنجھوڑ کر اٹھایا'' ماما اپنے کمرے میں نہیں ہیں''

''سمندر کے کنارے walk کر رہی ہوں گی''۔

''وہاں بھی دیکھ آیا ہوں۔ ماما کہیں نہیں ہیں'' چھوٹے کا دل جیسے ٹوٹ رہا تھا۔

دونوں نے دور دور تک۔۔۔ ساحل کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ماما کا کچھ پتہ نہ تھا۔

اندر ماما کے تکیے کے نیچے ایک ننھا سا کاغذ ان کی راہ تک رہا تھا۔

''رات مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ میری تو تکمیل ہو چکی ہے۔ تم دونوں کی صورت میں۔ اب میرے وجود کا جواز ختم ہو گیا ہے۔ دوبارہ خود کو ٹکڑوں میں بٹا دیکھنا!!۔۔۔۔ یا تم میں سے کسی ایک کو بھربھری ریت میں بدلتے دیکھنے کی ہمت اب شاید مجھ میں نہ ہو۔ میں جا رہی ہوں۔ بہت خوش، مطمئن اور مکمل۔ تم بھی زندگی

میں اگر کوئی بت بنانا تو اس کے سینے میں دل رکھنا نہ بھول جانا۔ بہت تکلیف دیتے ہیں یہ بے دل بت''۔

اور ماما جسے مکمل ہو جانے کا بہت شوق تھا، بھر بھری ریت بن کر سمندر کی لہروں میں ذرہ ذرہ بکھر چکی تھی۔

ساحل پر کھڑے چھوٹا اور بڑا دونوں ایک دوسرے کے دل میں داخل ہو چکے تھے۔۔۔

ایک ہی دروازے سے۔۔!!

☆☆☆

سپنی

(نوٹ: سپنی کا استعارہ اگرچہ جنس سے ہی منسوب ہے ادب میں لیکن یہاں اسے میں نے بدل کر کسی اور انداز میں استعمال کیا ہے۔)

پچھلے کچھ دنوں سے دھیمی، تیز، روتی، سرسراتی پراسرار سی سسکیاں اس کے گرد بین ڈال رہی تھیں۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اچانک کہیں سے ایک ہلکی سی سسکاری ابھرتی، پھیلتی جاتی اور پھر اچانک ہوکوں میں بدل جاتی۔ ہوکے بین کا روپ دھار لیتے۔

مینا کا تن بدن تار کی طرح تن جاتا۔ ہلکی سی سسکی سے جھنجھنا جاتا۔ پاؤں غلط پڑنے لگتے۔ سانسیں بے ترتیب ہونے لگتیں اور وہ نڈھال سی ہو جاتی جیسے میلوں کا، صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو۔

ایک عجیب سی اداسی، دور کہیں دل کے کونے میں چھپی وحشت، دھیرے دھیرے دل کی رگوں کو نوچنے لگتی۔۔۔ جانے یہ آسیب نما سسکی۔۔۔ کب اور کہاں سے اسے چمٹ گئی تھی۔

زندگی اسے بھی بالکل اسی طرح ملی تھی، جیسے دوسرے بہت سے لوگوں کو ملتی ہے۔ کھٹی میٹھی گولی جیسی کبھی اندر سے کھٹی باہر سے میٹھی۔ کبھی باہر سے کھٹی اندر سے میٹھی۔

لیکن یہ سسکی نہ کھٹی تھی اور نہ میٹھی۔۔۔ یہ تو زہریلی تھی۔ رگ رگ میں اتر جانے والی اور پھر بہت ساری سسکاریاں جانے کہاں سے کس فریکوینسی سے اس کے لہو میں آن شامل ہوتی تھیں۔ باہر سناٹا تھا، چپ کا سناٹا۔

پہلی بار مینا نے یہ سسکاری رات کے کسی پہر سنی تھی۔ یاد نہیں کہ کس پہر۔۔۔ سوتے میں یوں لگا تھا جیسے کسی نرم سے ہاتھ نے اس کے گالوں کو چھوا ہو۔ روئی سا نرم گرم ہاتھ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لمس چہرے پر دہک رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ سن سی پڑی رہی۔ دھیرے دھیرے گردن گھما کر دیکھا، اس کا شوہر اس کی جانب پشت کئے سو رہا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے شانوں کے بیچ ایک تل ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ گردن پر ہلکا سا خم کھائے گھنیرے بال خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ مینا نے کئی بار آصف سے فرمائش بھی کی تھی کہ چھوٹے چھوٹے کٹورہ کٹ بال رکھ لے۔ مگر آصف کو محبت سے پالے بالوں سے پیار تھا۔ وہ ہنس کر ٹال جاتا۔۔۔ جانے ایسے خم دار لمبے بال مینا کو کیوں Girlish look دیتے تھے۔۔۔؟ اس نے ایک گہری سانس لی۔ غیر ارادی طور پر اس کا ایک ہاتھ سرک کر آصف کے شانے پر ٹک گیا۔ مگر قریب سے ابھرنے والی ایک سسکاری نے اس میں کپکپاہٹ بھر دی۔ مینا سر تا پا لرز گئی۔ اس کی سانس رک سی گئی پل بھر کے لئے۔۔۔ ڈرتے ڈرتے بیڈ کی دوسری جانب نظر کی تو وہاں کچھ نہ تھا۔ عمیق سناٹا۔۔۔ گھور اندھیرا۔ سسکی پھر کہیں قریب ہی سے ابھری۔ مینا آصف کی پشت سے یوں چپک گئی جیسے آکاس بیل کسی دیوار سے لپٹ جاتی ہے۔

کئی لمحے صدیاں وہ نیم تاریکی کے بطن سے ابھرنے والی کسی تیسری سسکاری کی منتظر رہی۔ لیکن خاموشی جیت گئی تھی۔ جانے کب نیند نے اس کی پلکوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

صبح آصف کے لبوں پر شریر سی مسکان تھی۔ اس نے تیکھی نظروں سے مینا کو دیکھا۔ مینا کا ستا ہوا چہرہ اُسے حیران کر گیا۔

Are you okay?

yes

sure?

I am fine.

بس یونہی رات نیند ڈسٹرب تھی۔

آصف کے چہرے پر پھر پھلجڑی سی چھوٹی۔

''تو مجھے جگا لیتیں۔''

مینا جو ایسے گدگداتے فقروں پر بلش کر جایا کرتی تھی، بے رنگ تاثر، بے کیف سی اسے دیکھتی رہی۔ خالی خالی نظروں سے۔

آصف فکر مند ہو گیا۔

''لگتا ہے نئے گھر میں تمہارا دل نہیں لگ رہا۔ آج جلدی آؤں گا، آؤٹنگ کے لئے چلیں گے۔ مینا اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ نئے گھر میں سب کچھ اس کی منشا اس کی چاہت کے عین مطابق ہے۔ یہ علاقہ، سبزہ، پھول، لان سب اس کے خوابوں کا حصہ ہیں۔ مگر وہ ایک سسکاری۔۔۔؟

وہ کچھ نہ بول سکی۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اس خوبصورت تعلق کو قائم ہوئے۔ خواہ مخواہ میں خود کو ڈرپوک اور وہمی سی عورت کا تاثر دینا اسے اچھا نہیں لگا۔ آصف میں وہ سب کچھ تھا، جو کسی بھی عورت کی تمنا ہوتی ہے اور بقول آصف کے مینا اس کا آئیڈیل تھی۔

تو پھر مینا کیوں کر اپنی ایک کمزوری آصف کے حوالے کر دیتی اور وہ بھی محض ایک وہم کی بنیاد پر؟

کتنے ہی دن اس بے کلی کی نذر ہو گئے۔ مینا کا چیک اپ حمل کا ٹیسٹ۔ آصف واقعی پریشان تھا کہ تمام رپورٹس ٹھیک ہیں اور مینا پژمردہ۔ عجیب سی اداسی نے گھر میں پنجے گاڑ دیئے۔ مینا نے اداسی کے پاؤں کاٹے اور اسے گھر سے دھکیل دیا۔ آصف کے چہرے کا تناؤ بھی ڈھیلا پڑنے لگا۔

بہت دنوں کی مسلسل بارش کے بعد سنہری سنہری دھوپ کا آنچل پھیل رہا تھا۔ مینا اپنے بدن کو اس آنچل میں لپیٹے پور پور کو تھپک رہی تھی۔ انگ انگ ریلیکس ہو رہا تھا۔ ایک سرور آمیز حدت نے مینا کی آنکھوں کو دھیرے سے موند دیا۔ وہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی اور موندی موندی آنکھوں سے نیلگوں آسمان پر بادلوں کی ڈولتی تیرتی کشتیوں کو دیکھنے لگی کہ چھمیاں کی آواز نے اس کی سوچ کا سحر توڑ دیا۔

''باجی جی۔۔۔باجی جی۔۔'' وہ پھولے سانس کے ساتھ ہانپتی کانپتی، پور پور سے ہیجان ٹپکاتی شوخ رنگوں کی چادر زمین پر گھسیٹتی تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ مینا اس افتاد کے لئے ذہنی طور پر ہر گز تیار نہ تھی۔ اس نے ناگواری سے موندی آنکھوں کو مزید تھوڑا سا کھولا اور چھمیاں کو یوں دیکھا کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے لگائے جیسے کہہ رہی ہو

''بکو اور جاؤ۔۔۔''

مگر چھمیاں کے چہرے کا دبا دبا اضطراب اور انکشاف کے کرنٹ سے جھٹکے کھاتا بدن مینا کو سیدھا ہو کر بیٹھنے پر مجبور کر گیا۔ وہ پہلو بدل کر سر اٹھا کر چونکی ہو کر کسی افشائے راز کے انتظار میں چھمیاں کو دیکھنے لگی۔

''باجی جی۔۔۔باجی جی۔۔۔وہ پرے برساتی نالا ہے نا جی۔۔۔'' چھمیاں کے سانس ابھی تک بے قابو تھے۔ کسی انہونی نے اس کی زبان بندی کر کے پورے بدن کو زبان دے دی تھی۔ اس کا انگ انگ بے چین تھا۔

''کیا ہوا وہاں پر۔۔۔؟''

مینا کے لہجے میں دلچسپی تھی۔ چھمیاں کی آنکھیں اُبل کر باہر آنے کو تھیں۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ اظہار کی شدت سے مگر بمشکل تمام وہ اتنا ہی بول پائی اٹک اٹک کر۔

''وہاں۔۔۔وہاں سے ایک بچہ ملا ہے جی۔۔۔''

مینا کے گرد گردش کرتا آسمان رک سا گیا۔ کائنات ساکت ہو گئی۔

''بچہ۔۔۔؟ کیسا بچہ۔۔۔؟''

''گورا چٹا۔۔۔نیلی آنکھوں والا۔۔۔شاپر میں پڑا تھا جی۔۔۔''

چھمیاں کے لہجے میں وہ بچہ ہمک رہا تھا۔ ''آغوں۔۔۔آغوں۔۔۔''

اس انکشاف کے ساتھ ہی چھمیاں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے اندر کا سارا غبار باہر الٹ دیا اور شانت سی ہو کر گھاس پر ڈھیر ہو گئی۔ اپنی چادر اُتار کر اُس نے پاؤں پھیلا دیئے۔

''شاپر میں بچہ۔۔۔؟'' مینا کو اپنی آواز پاتال سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اچانک ہی اس کے پیٹ سے آگ کا ایک گولا سا اٹھا اور حلق میں آن کر بیٹھ گیا۔ سارا بدن جلنے لگا۔ تڑ تڑ تڑ۔

حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ سر کرسی کی پشت پر پھینک کر نیلے خلا کو دیکھنے لگی، جہاں کوئی کنارہ نہ تھا۔ چھمیاں مینا کے اندر چلتے Twister کی رفتار سے بے خبر

گھاس پر اب پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ اپنے چپل اتار کر اس نے قرینے سے ایک جانب رکھ دیئے۔

پتہ نہیں کس نے منہ کالا کیا ہے؟ پر بچہ اتنا خوبصورت ہے بی بی جی کہ بس۔۔۔''

چھمیاں کی آواز میں نفرت اور محبت دونوں باری باری بولیں۔

گناہ خوبصورت ہی ہوتا ہے۔۔۔ مینا نے کہنا چاہا مگر اس کی آواز کائنات میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ چھمیاں سے بہت کچھ پوچھنا، بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔۔۔ مگر الفاظ اس کے وجود سے الگ کھڑے، اسے گھور رہے تھے اور اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ بولنے کی کوشش میں وہ محض اوں آں کر کے رہ گئی۔

چھمیاں کے بیان کو بریک لگ گئی۔۔۔ اس نے تشویش کے ساتھ زرد چہرے والی مینا کو دیکھا۔

''بی بی جی کتنی دردمند ہیں۔۔۔ کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔۔۔'' چھمیاں کی سوچ۔۔۔ مینا کی خالی خالی نگاہوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ آئی کہ وہیں دُور اندر کہیں اَتھاہ گہرائی میں شاپر میں لپٹا ایک گول گوتھنا سا بچہ۔۔۔ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔۔۔ وہ سانس لینا چاہتا تھا۔۔۔ مگر شاپر کی یخ، بے رحم دیوار اور اس کے اور زندگی کے درمیان حائل تھی۔۔۔ مینا نے نیند کے عالم میں سسکتے ہوئے شاید خود سے پوچھا:

''کہاں ہے بچہ۔۔۔؟''

مینا کی حالت کو بھول کر چھمیاں کے بیان کو پھر پہیئے لگ گئے۔

''کچی آبادی کے دو جوڑے بے اولاد ہیں جی۔ دونوں ہی لڑ پڑے بچے کی خاطر۔۔۔ بڑے بوڑھے بیچ میں آئے۔۔۔ رفیق کو مل گیا بچہ۔۔۔ وہی جس کی بیوی پچھلے دنوں بیمار تھی۔'' وہ لحظہ بھر رکی۔۔۔ اس کی سانس پھر پھول چکی تھی۔

''رفیق کے گھر تو جھنڈیاں لگ رہی تھیں۔۔۔ چار درجن بوتلیں بھی منگوا لی ہیں اس نے، ساری آبادی کی دعوت کی ہے آج اس کے گھر۔۔۔ ٹھیک کیا نا اس نے۔۔۔؟

مینا نے اٹھنا چاہا۔۔۔ مگر پاؤں پتھر کے ہو چکے تھے۔ وہ کرسی میں دفن ہو چکی تھی۔ اس نے دور سے کہیں کائنات کے کسی بھولے بسرے کونے سے آتی ہوئی اپنی آواز کو سنا۔

''پتہ نہیں۔۔۔ رفیق کے لئے کوئی مسئلہ نہ بن جائے کل۔۔۔'' پوری لکھت پڑھت ہوئی ہے جی۔۔۔ تھانے میں۔۔۔ مولوی صاحب نے بچے کے کان میں اذان بھی دی ہے۔''

چھمیاں چہک کر یوں بولی جیسے۔۔۔ بچے کے جنم سے اس کو گود لینے تک کا سارا مرحلہ اس نے طے کیا ہو۔۔۔ پھر اپنے ہی خیال کو جیسے جھٹلاتے ہوئے بولی

''شاپروں میں ڈال کر پھینکنے والے کب پوچھنے آتے ہیں۔۔۔''

اس رات مینا دیر تک جاگتی رہی۔ سسکاریوں کے خوف سے۔ جو ساری رات اس کے اطراف ابھرتی رہیں۔ ہوکوں میں بدلتی رہیں، بین تالیاں بجاتے رہے۔ مینا نے گھبرا کر آصف کو دیکھا کہ کہیں وہ ان آوازوں سے جاگ نہ جائے، لیکن وہ تو گہری نیند سو رہا تھا۔۔۔ پرسکون غافل۔

مینا کے ذہن کی سکرین پر۔۔۔ شاپر میں لپٹا گول گوتھنا سا بچہ۔۔۔ ہمکتا روتا رہا۔۔۔ شاپر پھاڑ کر۔۔۔ ہوا میں تیرتا ہوا۔ مینا کے اطراف میں غوں غاں کرتا ہوا۔۔۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا۔۔۔ جیسے مینا گلے لگانا چاہتی ہے مگر دور ہٹتا جاتا۔۔۔ حتیٰ کہ بچہ دور کہیں اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔۔۔ بس دبی دبی سسکیاں رہ جاتی

ہیں۔۔۔اندھیرے کی گود بھرنے لگتی ہے۔

تمام رات مینا کا سارا وجود شعلوں کی زد میں رہا۔ ناف کے قریب اٹھتی لپٹیں سارے بدن کو پھونک رہی تھیں۔۔۔حدت۔۔۔اندر باہر سے جلا رہی تھی اسے۔ جانے کتنے ہی گلاس پانی کے پی ڈالے۔ رواں رواں چنگاری بنا تھا۔۔۔تپش کیسے کم ہوتی؟

ادھ کھلے پپوٹوں اور چبھتی روشنی کے نیزوں کے ساتھ اس نے سنا۔ آصف چھمیاں کو بہت تیز بخار۔۔۔اور اس کی دواؤں کے بارے میں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔۔۔شاید اس نے جلدی آنے کا بھی ذکر کیا تھا، لیکن مینا بے خبر ہو چکی تھی۔۔۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو چھمیاں ایک نئے انکشاف کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی۔۔۔

''باجی جی۔۔۔باجی۔۔۔وہ۔۔۔وہ بچہ رات کو مر گیا۔۔۔''

چھمیاں یوں رو رہی تھی جیسے اس کی اپنی کوکھ اجڑ گئی ہو۔۔۔مینا کا جسم خود بخود اٹھ گیا۔۔۔ٹھنڈا ٹھار ہو کر تکیہ سیدھا کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''کب۔۔۔؟''

چھمیاں پلو سے آنکھیں صاف کر کے ناک پونچھتے ہوئے بولی ''آج رات کو جی۔۔۔پتہ نہیں کب سے نالے میں پڑا تھا سردی سے نمونیہ ہو گیا تھا اسے۔''

مینا کے گرد اچانک ہی سسکاریوں کا بھانبڑ جلنے لگا لیکن یہ بھانبڑ اسے یخ بستہ کر گیا۔۔۔وہ بے جان سی ہو کر تکیے پر ڈھے گئی۔۔۔چھمیاں گھبرا گئی اس کی حالت دیکھ کر وہ جلدی سے چائے لانے کو بھاگی۔۔۔باہر کی طرف۔

مینا خود سے مخاطب ہوئی۔ یوں جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہو اور وہ اکیلی اس زمین پر کھڑی ہے۔

''اسے جنم دینے والی کو یہ تو پتہ ہو گا نا کہ نالے میں اندھیرا ہے۔ جنگلی کتے ہیں۔۔۔سؤر ہیں کیڑے مکوڑے۔۔۔اور موت۔۔۔'' مینا نے کو خوف کا دامن تھام لیا اور موت کی زردی اس کے وجود میں اترنے لگی۔۔۔

چھمیاں نے اس کے پیلے چہرے کو دیکھ کر اسے جھنجھوڑا اور جھٹ پٹ اسے اونچا کر کے چمچ سے چند گھونٹ چائے کے اس کے حلق میں انڈیلنے کی کوشش کی۔

آبِ حیات کے چند قطرے حلق میں پڑے تو مینا بڑبڑائی۔ ''کتنا بڑا دل ہو گا۔۔۔اس کوکھ جلی کا۔''

''کس کا جی۔۔۔'' چھمیاں پہلے تو مینا کی حالت کی وجہ سے بات سمجھ نہ پائی، پھر فوراً ہی بولی

''بڑا دل بی بی جی۔۔۔؟ وہ حرامن تو ڈائن ہے ڈائن۔۔۔'' اپنے عیش کا کڑوا پھل اگل دیا۔۔۔

میرے ہتھے چڑھے تو گلا دبا دوں۔۔۔ایسی عورت کا۔۔۔''

چھمیاں مینا کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر مطمئن ہو کر یوں غرائی جیسے واقعی وہ کسی ان دیکھی عورت کا منہ نوچ رہی ہو۔۔۔

''اپنی کوکھ نوچ کر۔۔۔موت کی سیاہی میں پھینک دینا آسان نہیں ہے۔ کوئی مجبوری ہو گی۔''

جانے کیوں وہ اجنبی قاتلہ کی وکالت کر رہی تھی۔ جیسے وہ اس ناگن کو جانتی ہو۔۔۔پہچانتی ہو۔۔۔مجبوری۔۔۔؟ منہ کالا کرتے کوئی مجبوری نہ تھی۔۔۔نو مہینے پیٹ میں اٹھائے پھری۔۔۔تب کوئی مجبوری نہ تھی۔۔۔''

چھمیاں غضب میں بولے جا رہی تھی۔۔۔

''باجی جی۔۔۔یہ عورتیں نہیں۔۔۔سپنیاں ہوتی ہیں،سپنیاں اپنی اولاد کو بھی کھا جاتی ہیں۔۔۔'' ''آپ نہیں جانتیں انکو۔۔۔''چھمیاں نے نفرت سے منہ سکوڑا۔۔۔اور برتن اٹھا کر چل دی۔مینا نے چھمیاں کے الفاظ کو دانتوں تلے چبانا چاہا مگر وہ پتھر کی طرح سخت تھے۔۔۔

''کیا واقعی میں نہیں جانتی۔۔۔کسی سپنی کو۔۔۔؟''

اس نے اپنے الفاظ نگلنا چاہے۔۔۔اس کی نظر سامنے پڑے قدِ آدم آئینے پر پڑی۔جہاں دھندلا دھندلا سا ایک عکس ڈول رہا تھا۔۔۔وہ بڑبڑائی۔

''اس نے نو ماہ دکھ تو سہا۔۔۔اپنے خون سے سینچا تو سہی۔۔۔سپنیاں تو وہ ہوتی ہیں جو اپنے انڈے کھا جاتی ہیں۔۔۔کچے انڈے۔۔۔''

اسی لمحے سسکیوں کی آواز کہیں دور سے ابھرنے لگی جو دھیرے دھیرے ہوکوں میں اور پھر بین میں بدل گئی۔۔۔

آئینے پر لہراتے سے سائے چھا گئے۔۔۔کالے بھورے نیلے پیلے۔۔۔چاروں طرف کوڑیائی زہریلی زبانیں لہرا رہی تھیں۔سرسراہٹ سے سارا کمرہ بھر گیا۔۔۔مینا کا بستر۔۔۔کراہت آمیز نرماہٹ کی آماجگاہ بن گیا۔۔۔مینا چیخ مار کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔۔۔سرسراہٹ اس کا پیچھا کرنے لگی۔۔۔وہ بھاگنے لگی۔۔۔بھاگتی گئی۔۔۔کمرے سے لان سے گیٹ سے باہر سڑک کے پار۔۔۔اس نالے کی طرف۔۔۔جہاں اندھیرا تھا۔۔۔سؤر تھے۔۔۔جنگلی کتے تھے۔۔۔اور کیڑے مکوڑے جہاں شاپر میں سانس لینے کی خواہش میں ایک گورا چٹا بچہ۔۔۔ہمک رہا تھا۔سارا گھر۔۔۔ساری کائنات زہریلی سرسراہٹ سے بھر چکی تھی۔

☆☆☆

Sanctioned

دُھند بہت گہری تھی۔۔۔سرخ رنگ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔اس نے آئینے میں جھانکا۔اس کا عکس کہیں کھو چکا تھا۔۔۔ہر طرف سرخ دُھند تھی۔۔۔ہاں ایک ہیولیٰ سا تھا۔۔۔شاید وہ خود تھا۔۔۔وہ بڑبڑانے لگا''یہ سرخ رنگ۔۔۔ہر طرف سرخ رنگ۔۔۔کب میرا پیچھا چھوڑے گا۔۔۔یہ۔۔۔یہ سرخ رنگ۔۔۔؟''اس کی بڑبڑاہٹ بتدریج اونچی ہوتی چلی گئی۔۔۔اور ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

آئینہ کرچی کرچی ہو چکا تھا۔۔۔اور اس کے ہاتھ پر بھی سرخ رنگ تیر رہا تھا۔

دروازے سے لگی اس کی ماں اندر آگئی۔حسن کا وحشت زدہ چہرہ۔۔۔ہاتھ سے بہتا خون۔۔۔اس نے گھبرا کر آواز دی۔

''بینا۔۔۔بینا جلدی سے آنا۔حسن کا ہاتھ زخمی ہے۔۔۔''

''یا اللہ خیر''وہ تیزی سے حسن کی جانب لپکی۔۔۔جو بہتے خون کو گھورے جا رہا تھا۔ماں نے جلدی سے اپنا دوپٹہ زخم پر رکھا اور دوسرے پلّو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

چند لمحوں میں حسن کی بہن ڈیٹول اور روئی لیے موجود تھی،بغیر کچھ بولے اس نے

جلدی جلدی حسن کے ہاتھ کی مرہم پٹی کی یوں جیسے یہ روزمرہ کا معمول ہو، حسن بغیر کسی چوں چرا کے اس کے سامنے موم کا گُڈّا بنا رہا۔۔۔ماں کی زیرِ لب دعائیں اور نادیدہ ہستیوں کو دیے جانے والے کوسنے، اُس کی سماعت کی حدود سے پرے ہو کر گزر رہے تھے، شاید۔۔۔تبھی اُس کا چہرہ بے تاثر اور نگاہیں خالی تھیں اُس کے دل کی طرح۔۔۔

اسے پردیس سے آئے قریباً دو ماہ ہو چلے تھے۔ وحشت بھری آنکھوں۔۔۔اذیت ناک چہرے اور ہسپتال کی ایک رپورٹ سمیت جب وہ وطن واپس پہنچا تھا تو بلائیں لینے والی ماں اور جان دینے والی بہن۔۔۔گھنٹوں نہیں۔۔۔راتوں تک کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر دھاڑیں مارتی تھیں۔ چند ماہ پہلے دیکھے گئے سپنوں کی اتنی بھیانک تعبیر تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

کچھ بتلاتا بھی تو نہیں تھا وہ۔۔۔بس ٹکر ٹکر دیکھے جاتا تھا اور پھر اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔۔۔کبھی کمرے میں اور کبھی باہر۔۔۔رات گئے سردی میں ایک قمیض میں گھومتا رہتا گلیوں میں۔۔۔اور اندر لحاف میں سمٹی ماں کا بدن سردی سے ٹھٹھرتا رہتا۔

جانے کون سی آگ تھی اُس کے اندر......سگریٹوں کے پیکٹ کے پیکٹ راکھ ہو گئے تھے۔۔۔مگر سلگن باقی تھی۔

دبے لہجے میں ملنے جلنے والے آنکھ بچا کر اُس کی اچانک اور بدحال آمد کا پوچھ بیٹھتے تو وہ اُلجھ سا جاتا۔ سوال مشکل تھے یا جواب کھو گئے تھے؟۔۔۔وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود سے پوچھتا رہتا۔۔۔سرگوشیاں غصیلے لہجے سے چیخوں میں بدل جاتیں۔ ماں اور بہن کا دل لرزنے لگتا۔۔۔یہ وہ حسن تو نہیں تھا جو ہنستا مسکراتا اُن سے رخصت ہوا تھا۔ یہ تو اُس کا سایہ تھا، صرف سایہ! اور ان کے لیے اس دورِ پُر

آشوب میں یہ بھی غنیمت تھا شاید۔

خاوند تو کئی سال پہلے چل بسا تھا۔۔۔دیور جس ڈاکٹر کو لایا تھا اس کا یہی کہنا تھا کہ باہر اِس کا دماغ اُلٹ گیا تھا۔۔۔یا دوسرے الفاظ میں ذہنی طور پر وہ معذور تھا۔۔۔مگر کیوں کیسے؟ کون بتاتا کہ اس پر کیا بیت گئی تھی۔ وہ تو اکیلا ہی چلا تھا دنیا فتح کرنے۔۔۔نہ حسن اب ہسپتال جانے پر راضی تھا اور نہ ہی ماں کا دل اسے پاگلوں کے ہسپتال بھیجنے پر مانتا تھا۔ اس کے نزدیک ذہنی مریض پاگل ہی تو تھے۔۔۔ڈاکٹر کی دوائیں بینا باقاعدگی سے اسے کھلاتی وہ چپ چاپ اندر پڑا رہتا۔۔۔یا اچانک ہی اٹھ کر گاؤں کی گلیاں ناپنے لگتا۔۔۔دن رات وظیفے۔۔۔چڑھاوے، منتیں ننگے پاؤں مزاروں کی حاضریاں۔۔۔سبھی کچھ ہو رہا تھا۔ حسن یہ سب دیکھتا سنتا۔ کبھی آپ ہی آپ مسکرا دیتا اور کبھی بپھر جاتا۔۔۔"بند کرو یہ ڈرامے۔۔۔میں نہیں مانتا کسی خدا کو۔۔۔خدا کہاں تھا جب سلمان اور یاسر گم ہو گئے۔۔۔جب۔ جب۔ جب" اور پھر جیسے وہ خود کہیں گم ہو جاتا۔

یا اللہ یہ سلمان اور یاسر کون ہیں!۔۔۔یا اللہ میرا بچہ بے خبر ہے، بیمار۔۔۔تو اسے معاف کر دے۔۔۔اسے ہدایت دے۔۔۔اسے ٹھیک کر دے"

ماں اشکوں کی روانی میں ہی بولے چلی جاتی۔

پھر ایک رات کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے کسی خواب کی طرح اس پر منکشف ہوا کہ اسے پردیس میں Sanction کر دیا گیا تھا۔ اسے خطرناک نفسیاتی مریض (شیزوفرینگ) قرار دے کر سب سے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ اس پر پڑھائی، نوکری حتیٰ کہ زندگی کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

پہلی دنیا کی مہذب اور بہترین سوسائٹی میں غیر مہذب اور نامکمل وجود کی کوئی

جگہ باقی نہیں رہتی۔۔۔اور خاص طور پر جب اس وجود کا تعلق ہو بھی تیسری دنیا سے۔۔۔ویسے بھی تیسری دنیا والوں کے لیے ہر نعمت پر Sanction لازمی تو ہیں۔۔۔ چاہے وہ سامانِ حرب ہو یا انسانی جذبات، کیوں کہ پہلی دنیا کو تیسری دنیا کی سانسوں تک رسائی حاصل ہے۔اب تو وہ ان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔۔۔لیکن یاداشت کے کچھ صفحے غائب تھے۔اسے شیزوفرینک کیوں قرار دے دیا گیا تھا۔۔۔؟ وجہ ابھی نامعلوم تھی اس کے ذہن کے لیے۔

ماں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ زندہ سلامت نظروں کے سامنے موجود ہے۔وہ اس دکھ کو بھی اللہ کی رضا سمجھ کر صبر کر چکی تھی۔ ملنے جلنے والے، رشتے دار یوں احتیاط سے اس سے ملتے اور بات کرتے جیسے وہ کوئی انتہائی مقدس اور نازک سی چیز ہو جو ہاتھ لگنے سے ناپاک ہو سکتی ہے،ٹوٹ سکتی ہے۔

اسے دماغ خراب، پاگل یا سائیں کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔اس کا دماغ ''پہلی دنیا'' کی سرزمین پر اُلٹا تھا۔وہ تیسری دنیا کی گلیوں کی خاک چھان کر تھوڑا ہی ذہنی مریض بنا تھا جسے پتھر مارنا کارِثواب سمجھا جاتا۔۔۔

کبھی کبھار ذہن کے کسی گوشے میں چھپاکے ہوتے۔۔۔یاداشت کے کچھ صفحے نظر آنے لگتے۔ Sanctioned کا لیبل لگائے، پہلی دنیا کے حصوں سے وہ گزر رہا ہے۔۔لوگ دُور دُور ہٹ رہے ہیں،خوف اُن کی آنکھوں سے جھانک رہا ہے۔۔۔وہ بار بار اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا۔جیسے تیسری دنیا کے ہر شخص کے ماتھے سے Santioned کا لیبل ہٹانا چاہتا ہو۔اس کی یہ عادت ماں کو پریشان کر دیتی۔

''بیٹا لگتا ہے شاید اِس کے اندر جن گھس گیا ہے۔دیکھو تو کیسے ماتھے کو نوچ رہا ہے''

اندیشوں بھری آواز اُبھرتی۔جواباً بیٹا ایک سرد آہ بھرتی۔

''اماں علاج ہو رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا بھی پیر صاحب کا بھی۔تم بس دعا کرو، پریشان نہ ہو۔ٹھیک ہو جائے گا۔۔''

پتا نہیں پیر صاحب کی کرامت تھی۔ڈاکٹر کی دواؤں کا اثر، یا ماں کے آنسوؤں کی طاقت۔حسن کا دماغ سے چپکا ''سایہ'' دُور ہونے لگا۔اس کی بڑبڑاہٹ چیخوں کی بجائے اب بے ربط جملوں میں ڈھلنے لگی۔ماں اور بہن کی آنکھوں کی لو بڑھنے لگی

بے ربط جملے۔۔حالات و واقعات کا تسلسل قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے اور پھر کہانی وجود میں آتی چلی گئی۔تیسری دنیا کے باشندے کی پہلی دنیا میں آپ بیتی؟

حسن اور سلمان یونیورسٹی سے آ کر بیٹھے ہی تھے TV آن کیا حسبِ معمول زور و شور سے ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے والے طیاروں پر تبصرے تجزیے اور خبریں جاری تھیں۔ چند دن پہلے ہونے والے حادثے نے سبھی کو متاثر کیا تھا۔حسن تھکا ہوا تھا،سونے چلا گیا۔۔۔اچانک رات کے کسی پہر یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا۔چیزیں پٹخی جا رہی تھیں اس نے سنا۔۔۔گالیوں کی یلغار تھی۔تیز تیز لہجے تھے۔۔۔سلمان کی چیخیں تھیں اور یاسر کے ٹوٹے پھوٹے جملے۔۔

No, No we've done

Nothing dont do this please do it.

حسن نے کچھ کہنا چاہا تو اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی گئی آنکھ کھلی تو وہ تینوں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند تھے۔یاسر ایک جانب نیم دراز تھا، دیوار سے ٹیک لگائے۔اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔آنکھیں بھی پھٹی پھٹی تھیں اور جا بجا خون کے چھینٹے اس کے وجود کو رنگین کر رہے تھے۔

وہ ان تینوں میں سب سے چھوٹا تھا اور حال ہی میں فیصل آباد سے آیا تھا۔ تب اس کی آنکھوں میں صرف حیرت تھی خوشگوار حیرت، مگر اب دہشت کا بسیرا تھا۔ سلمان اور حسن اسے چوزہ کہتے تھے۔ معصوم سا چوزہ جس کی اُڑان کے پَر ابھی پوری طرح کھلے نہ تھے۔

سوجے زخمی چہرے اور جسم کے ساتھ بے ہوش پڑا سلمان جس کی تیز طرار زبان اس وقت خاموش تھی۔ تین سال سے پڑھائی اور مزدوری کرنے والا سلمان رات کو ڈٹ کر شراب پیتا۔ ڈٹ کر ناچ کرتا اور ڈٹ کر جوا کھیلتا تھا۔ کالا ہو کر خود کو سفید رنگ میں رنگنے کی کوشش میں مصروف...... وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ کالے رنگ پر سفید نہیں سرخ رنگ چڑھتا ہے۔

”وہ علی الاعلان کہتا تھا“ ہم نے صرف ان کا کلمہ پڑھا ہے۔ یہ پورا قرآن، پوری سنت گھول کر ہی پی گئے ہیں۔ اِن کی سوشل لائف دیکھو یار۔۔۔ تبھی تو ترقی کر گئے۔ ہم پر غالب آ گئے۔ They deserve خدا کو تو ساری مخلوق پیاری ہے۔ جو محنت کرے گا صلہ پائے گا۔۔۔“ ہر وقت ان کے کلمہ پڑھنے والا سلمان دہشت گردی کا الزام کیسے برداشت کرتا...... وہ نہیں سن پایا اور نہ سننے کی پاداش میں وہ سننے کی حس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا تھا۔ تینوں کے جسموں پر ایک ہی رنگ غالب تھا۔ سرخ رنگ۔۔۔ نہ کالا نہ گورا۔۔۔ حسن کو تو دہشت گرد کا مطلب ہی یہاں آ کر سمجھ میں آیا تھا۔۔۔ یہ انکشاف بھی حیران کن تھا کہ اس سے محبت کرنے والے، روایتوں سے جڑے۔۔۔ محنتی ہم وطن دہشت گرد کہلاتے ہیں، یہاں۔۔۔ اس کا ذہن اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا اور یہی اس کا جرم بن گیا۔

پھر آنے والے کئی لمحے دن ہفتے مہینے جانے کس کس اور کیسی کیسی اذیت کے گواہ

بنے۔۔۔ اسے نہیں یاد، سلمان اور یاسر کا کیا بنا! وہ زندہ ہیں یا نہیں۔۔۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس کے کاغذات پر Sanctioned کا ٹھپہ لگا کر اسے خطرناک نفسیاتی مریض قرار دے کر پاکستان جانے والے ایک جہاز پر سوار کر دیا گیا۔

وہ تیسری دنیا کا باشندہ تھا۔ تیسری دنیا ہی اس کی دنیا تھی اور Sanctions اس کا مقدر!

☆☆☆

باسٹرڈ کون؟

ہم دونوں کی فلائیٹ اکھٹی تھی، دو چار بار اُچٹتی سی نظر ڈال کر میں ہاتھ میں پکڑی دلچسپ سادہ فوک لور کہانیاں پڑھنے میں محو ہوگئی، ائیر ہوسٹس کی مشروبات سمیت آمد نے مجھے چونکا دیا۔۔جو اپنے چہرے پر روائتی میک اپ اور مسکراہٹ چپکائے میری پسند پوچھ رہی تھی، میں نے اپنی ہم سفر کی جانب دیکھا، اسکے چہرے پر پھیلی عجیب سی دھند نے جانے کیوں میرے اندر ایک چٹکی بھری، وہ جسمانی طور پر حاضر تھی مگر غائب بھی تھی، چُست جینز پر چھوٹا سا کُرتا پونی میں گندھے ہوئے گھنگریالے بال، پُر کشش چہرہ ،آجکل یہ حُلیہ ہر دوسری خاتون اور لڑکی کا ہوتا ہے، مگر کیا تھا کہ میں بار بار اُسے کنکھیوں سے دیکھنے پر مجبور تھی، یہ کنوئیر بیلٹ سے سامان اُچکتے وقت بھی اسی کے انداز میں عجیب سی تمکنت اور وحشت کا امتزاج تھا

میں عام خواتین کے برعکس اپنی صنف کی خوبصورتی کو کُھلے دل سے سراہتی ہوں جس پر اکثر عجیب وغریب جملے بھی سُننے کو ملتے ہیں۔

جیسے ہی وہ اپنا بیگ اُٹھائے ہال سے نکلنے لگی میں تقریباً دوڑتی ہوئی اُس تک جا پہنچی۔

''ہیلو۔۔۔''میں نے پُکارا

اُس نے پلٹ کر دیکھا اور رُک گئی، حیرت آنکھوں میں لیے وہ مجھے دیکھنے لگی

''اپنا contact دے سکتی ہیں؟''میں نے فوراً اپنا مُدعا بیان کر دیا۔

شک نے اُسکی پلکوں پر خیمے تان لیے

''کس سلسے میں''اُسکی آواز قدیم غاروں میں گونجتی بازگشت جیسی لگی۔۔نرم۔۔سرسراتی پُراسرار آواز۔۔

''میں ایک لکھاری ہوں۔۔۔کہانیاں لکھتی ہوں''

''تو؟''ایک اُونچی دیوار اسکے لہجے میں کھڑی تھی۔

''frankly جانے کیوں لگا کہ آپ کی ذات سے کوئی کہانی وابستہ ہے''بغیر لگی لپٹی میں نے کہہ ڈالا

اُس کے میرے پر چند لمحوں میں صدیوں کی تھکن اُتر آئی، ہونٹ پھڑ پھڑائے ۔۔تمکنت اور اعتماد بھر بھری ریت کی مانند بیٹھنے لگا۔

''ہر انسان کی زندگی ایک کہانی ہوتی ہے۔۔۔''

وہ بمشکل کہہ پائی

''ہاں مگر کئی کہانیاں بہت انوکھی بہت پُراسرار ہوتی ہیں''

''تُم مجھے جانتی ہو؟''

''نہیں تو۔۔''اُسکی کیفیت اسی کے اندر آنے والے زلزلے کو میں محسوس کر کے تھوڑی شرمندہ بھی تھی۔۔مگر میرے اندر کی کہانی کار تالیاں بجانے لگی تھی

''ایک اور کہانی۔۔۔''!

ہم سب اکثر کس قدر خود غرض ہو جاتے ہیں، کبھی اپنی ذات اپنی خواہشات اور کبھی اپنے آدرشوں اور اپنے پیشے کی خاطر، اندر سے کسی آواز نے ڈانٹا بھی کہ چہرے

پر پھیلی مسرت اور تجسس کو عیاں مت کرو مگر اسکا لڑکھڑاتا لہجہ بدلتے رنگ کسی ایسی کہانی کا آغاز تھے جسکی میں تلاش میں تھی۔

میں نے اپنے لہجے میں تھوڑا دُکھ بھرا اور پوچھا

’’Sorry اگر آپکو بُرا لگا تو۔۔۔۔‘‘

’’نہیں۔۔۔نہیں‘‘ وہ جیسے کسی خواب سے چونکی

’’آئینہ تو عکس دکھاتا ہے، وہ جو اُسے نظر آتا ہے‘‘ اسنے پرس سے اپنا کارڈ نکالا جلدی سے ڈارک گلاسز کے ذریعے اپنی آنکھوں میں اُترتی نمی کو چھپائے بیگ جھلاتی تیز تیز قدموں سے ہال سے باہر نکل گئی۔۔

میں کارڈ پر دیکھا کسی NGO میں اسسٹنٹ کا عہدہ تھا۔۔

پھر کچھ یوں ہوا کہ دن شام میں اور شامیں راتوں میں بدلتی گئیں۔۔ میں کہانی کے ساتھ سفر کرتی رہی۔۔۔اُسے کھوجتی رہی ۔۔ وہ ریت کے بگولے جیسی تھی۔۔۔ بے قرار بے چین اور پل بھر میں بکھر جانے والی۔

اسکی ذات کی کئی پرتیں ۔۔۔کپڑے کے تھان کی طرح میرے سامنے کُھلتی چلی گئیں

خوبصورت ، بدصورت ، گُھٹے ہوئے جذبات اور ان دیکھے لوگوں سے بیک وقت وہ محبت اور نفرت کی سُولی پر لٹک رہی تھی ۔۔وہ!!

تنہا، بے حد تنہا!

ناموں اور چہروں کے مجدھار میں گھری اپنی شناخت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی ۔۔ اجنبی رویوں کی ظالم لہریں تھیں۔۔ پاؤں تلے زمین نہ تھی اور آسمان تو تھا ہی ظالم

بار ہا وہ جُھنجھلا کر مجھ پر بھی برس پڑتی مگر خود ہی معافی بھی مانگ لیتی

ایک رات ہم دونوں اسکے فلیٹ پر تھے، وہ بہت موڈ میں تھی۔۔حسبِ معمول میوزک ڈانس شراب کے وہ اکیلے ہی مزہ لے رہی تھی۔۔دو چار بار مجھے بھی اشارہ کیا ۔۔ڈانس میں کچھ دیر اس کا ساتھ دیا مگر شراب کا مرحلہ میرے بس میں نہ تھا۔

آخر مئے آتشی سر پر چڑھ کر بولنے لگی تو وہ بستر پر گر گئی۔۔ بازو ہوا میں لہراتے لہراتے وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی۔۔اس کے قہقہے گونجتے گئے۔۔ اچانک مجھ سے مخاطب ہوئی

’’مان گئی تمہیں!۔۔اپنی کہانی کی خاطر کتنے سکون سے صبر سے برداشت کر رہی ہو۔۔‘‘

’’you are great۔۔۔لیکن نکلیں تُم بھی خودغرض۔۔۔اپنی خواہش کی غلام۔۔۔تم مجھے میری خاطر ملتیں تو بات تھی ۔۔ہے نا؟‘‘

اسنے ہچکی لیتے ہوئے ایک اور پیگ چڑھالیا

’’مگر تمہیں ملنے کے بعد۔۔۔ تمہارے ساتھ وقت گذارنے کے بعد۔۔۔ تمہیں ایک دوست کی طرح چاہنے لگی ہوں۔۔‘‘

’’ہاہاہا ۔۔۔شش شش۔۔۔خاموش۔۔ آہستہ بولو ۔۔دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ۔۔ میرے جیسی گشتی کی دوست تُم بنوگی؟۔۔لوگ پتھر ماریں گے ۔۔تمہیں بھی طوائف کہیں گے۔۔۔نہ۔۔ ۔ شریف لڑکیاں میرے قریب نہیں آتیں‘‘

میں نے اسکے ہوا میں بھٹکتے ہوئے بازؤں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے پوری سچائی کے ساتھ کہا

’’مجھے کسی کی پرواہ نہیں ۔۔تُم میری دوست ہو اور ۔۔بس‘‘

’’ہاہاہا ۔۔۔میری کوئی دوست نہیں ۔۔۔تُم لکھو۔۔۔میری کہانی لکھو ۔۔ فراڈن ۔۔ مگر سچ لکھنا ۔۔۔اور ایک فیصد بھی ڈنڈی نہیں مارنا۔۔۔سارے جعلی نقاب نوچ ڈالنا ۔۔۔سب کے اصلی چہرے دکھانا ۔۔۔یہ سب ۔۔ یہ سب ۔۔ bastard ہیں اور مجھے باسٹرڈ کہتے ہیں‘‘

وہ رُک گئی ۔۔۔مگر انجانے میں اپنی ذات کے زندان کی چابی وہ میرے ہاتھ میں تھما چکی تھی ۔۔کچھ دیر وہ فضا میں بازو گھماتی اور گلاس کو لہراتی رہی ۔۔آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اسکے چہرے پر پھیل رہے تھے ۔۔۔میں نے پونچھنے چاہے تو تڑپ کر میرا ہاتھ تھام لیا

’’رونے دو یار۔۔۔رونے دو ۔۔اپنے سامنے تو رونے دو میری دوست ۔۔ دوست کہا ہے نا مجھے؟ ۔۔۔میرا مذاق نہیں اُڑانا باقی سب ہنستے ہیں ۔۔۔میرے دُکھ کو تماشا بناتے ہیں ۔۔اس گناہ کی پوٹ کے ساتھ گناہ کے لیے تیار ۔۔۔ثواب ہے نا یہ؟۔۔۔سنو کیا وہ سب سچ کہتے ہیں۔۔‘‘

وہ معصوم سی بچی کی طرح میری گود میں ڈھیر ہو گئی

’’نہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔۔‘‘ میں نے اسکے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

’’جھوٹی ۔۔جھوٹی ہو تُم ۔۔۔میں ہوں گناہ کی پوٹ ۔۔باسٹرڈ ۔۔ حرامی کی جنی ۔۔۔سُنا تُم نے ۔۔؟‘‘ وہ چلانے لگی

’’کون تھا وہ؟ کوئی خان، ملک، مزدور، ڈرائیور ۔۔۔وڈیرہ، شاعر یا سیاست دان ۔۔۔پھنسایا ہو گا میر ماں کو باتوں کے جال میں ۔۔ پر وہ کیوں آئی باتوں میں

؟۔۔۔یا وہ بھی گشتی تھی؟ ۔۔۔اگر میں پیدا ہو ہی گئی تھی ۔۔ تو مجھے کسی کے در پر کیوں پھینک گئی؟؟‘‘

’’نو مہینے پیٹ میں رکھا ۔۔۔پال نہیں سکتی تھی؟۔۔۔اُسے ذرا خیال نہ آیا۔۔ ۔رات کو بدبودار گلی میں مجھے کُتے بلیاں کھا جاتے ۔۔ مجھے کوئی گاڑی رکشا کُچل جاتا ؟ اُس ظالم عورت کو ترس نہ آیا مجھ پر ۔۔؟؟‘‘

وہ ہذیانی حالت میں بولے جا رہی تھی ۔۔۔میں نے اُسے کاندھے سے لگا کر تھپکا ۔۔۔میرے آنسو بھی خامشی سے باغی ہو رہے تھے۔۔

’’ہو گی کوئی مجبوری ۔۔۔‘‘ میں نے خود سے جھوٹ بولا شاید

’’کیسی مجبوری؟ ماں تو آگ میں کود جاتی ہے اُسی نے مجھے آگ میں دھکا دے دیا ۔۔‘‘

’’کوئی غریب مجبور عورت ہو گی‘‘

’’نہیں ۔۔جس نے مجھے اُٹھایا تھا اُسی نے بتایا تھا کہ میں قیمتی کمبل میں تھی ۔ ۔۔میرے کپڑوں میں چند ہزار کے نوٹ بھی رکھے تھے ۔۔۔‘‘

’’امیر زادی کی عیاشی تھی ۔۔۔مگر میرا کیا قصور تھا۔۔؟‘‘

اسی کا catharsis ہو رہا تھا۔۔اندر کا سیلاب باہر آ رہا تھا۔۔۔شراب نے لہو میں دوڑتے آتش فشاں کو بھڑکا دیا تھا ۔۔وہ اپنے سمیت ہر شے کو جُھلسانے پر تُلی تھی۔

’’جانتی ہو جنہوں نے اپنی دہلیز سے اُٹھا کر مجھے پالا پوسا ۔۔۔کیا قیمت وصول کی ۔۔؟‘‘ اُس نے مجھے پکڑ کر جھنجوڑا۔۔۔

’’نہیں ۔۔۔‘‘ میں نے مختصر جواب دیا

''ہاں تُم کیسے جان سکتی ہو؟ ۔۔ بدبودار گلی میں رہنے والی عورت نے میرے کپڑوں میں رکھے نوٹوں سے بہتر جگہ کرائے پر لے لی ۔۔ بارہ سال کی عمر میں میرا نکاح اپنے aids کے مریض بھائی سے کر دیا۔۔''

''ہاہاہا ۔۔۔ بارہ سال روٹیاں کھلانے کی کتنی بھاری قیمت میں نے ادا کی ۔۔؟''

وہ ہنستی چلی گئی ۔۔۔ قہقہے ۔۔ بین اور سسکیاں ۔۔۔ پھر وہ دھیرے دھیرے سرگوشی میں بولنے لگی ۔۔۔

''مجھے باہر کی دُنیا سے ڈرا دیا گیا تھا ۔۔۔ وہی تین کمرے میری کائنات تھے ۔۔ سارا دن گھر کا کام ۔۔۔ رات بستر پر وہ خوفناک بدبودار ہڈیوں کا ڈھانچہ!۔۔ خوف کے مارے میری چیخیں اندر ہی اندر گھٹتی گئیں ۔۔ جانتی ہو ۔۔ میں بولنا بھول گئی تھی ۔۔۔ تین سال تک وہ جانور مجھ پر جنسی اور جسمانی تشدد کرتا رہا۔۔''

اذیت کے احساس نے میری آواز بھی سلب کر لی تھی

''پھر ایک دن وہ مر گیا ۔۔۔ میں نے مار ڈالا اُسے''

پھر وہ اونچا اونچا بولنے لگی ۔۔۔

''وہ مجھے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا ۔۔ اپنی ناکامی پر جھنجھلا کر مجھے مارنے لگا ۔۔۔ چھڑی سے، جانے کہاں سے پہلی بار ۔۔۔ مجھ میں ہمت پیدا ہوئی ۔۔۔ شدید نفرت نے مجھے طاقت دی ۔۔۔ میں نے اُسے زور سے دھکا دیا ۔۔۔ وہ فرش پر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا ۔۔''

''اور تمہیں پولیس لے گئی؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا ۔۔

''نہیں'' زہر بھری ہنسی سسکاری بن کر اسکے ہونٹوں پر سرسرانے لگی ۔۔۔

''وہ شاطر عورت پولیس کے چکر میں پڑ کر پھنسنا نہیں چاہتی تھی ۔۔۔ اُس نے چُپکے سے بھائی کو دفن کیا ۔۔۔ مجھے دور دراز علاقے میں لے جا کر بیچ دیا ۔۔''

اب وہ ٹیک لگا کر کسی حد تک شانت سی نیم دراز ہو گئی ۔۔۔ پھر اُس نے سگریٹ سُلگایا ۔۔۔ اپنی سلگن کو بجھانے کے لیے شائد!!

''پھر ۔۔'' میں نے پوچھا

''پھر ۔۔۔ پھر میں شکاریوں کے جال سے پُھر ہو گئی''

''ایک نیک دل عورت نے پناہ دی ۔۔۔ کچھ پڑھا کچھ سیکھا اور ۔۔۔''

''اُف ۔۔۔ کتنے بڑے عذاب سے گُذری ہو تُم ۔۔''

اُسنے جواباً اُٹھ کر فرج سے وہسکی کی دوسری بوتل نکالی اور ۔۔۔ گلاس میں انڈیلی اور فضا میں کسی نادیدہ ہستی کو cheers کہ کر گلاس خالی کر دیا ۔۔

''اور اب ۔۔۔؟'' میں نے پوچھا

''ہاہاہا ۔۔ میری پیاری کہانی کار ۔۔۔ خیر ۔۔ ابھی تو کہانی کا climax باقی ہے''

میرے حواس پھر سے چوکنے ہو گئے ۔۔۔

''آخر کار میں نے اس عورت کو ڈھونڈھ نکالا''

اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خالی گلاس کو گال سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں

''جس نے تمہیں بیچا تھا؟''

''نہیں جس نے مجھے جنا تھا ۔۔۔ بُزدل گناہ کو تیار مگر نتیجہ بھگتنے کو نہیں''

''وہ کیسے؟'' میرے لیے ایک بعد ایک کلائمکس تھا ۔۔

''میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی ۔۔۔اُس عورت اُس مَرد سے انتقام کی آگ جو مجھے کوڑا سمجھ کر پھینک گئے تھے۔۔۔''

''کون ہے وہ؟''

''ایک بگڑی ہوئی امیر زادی جس کے Timepass نے میرے وجود کو جنم دیا۔۔ اس نے مجھے کوکھ میں کھلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر ایک اونچے رشتے کے چکر میں مجھے بدبودار گلی میں پھینکوا دیا۔۔''

''اگر اُس نے تمہیں اپنی مرضی سے پیدا کیا تو تمہاری خبر کیوں نہ لی؟''

''شاید پتہ کیا بھی ہو ۔۔۔مگر ہمارا ٹھکانہ جو بدل چکا تھا۔۔''

تمام تر نفرت کے باوجود وہ اپنی ماں کو بس کوئی excuse بھی نہیں دینا چاہتی تھی لاشعوری طور پر۔۔۔

''ویسے بھی ایک امیر زادے کے دو بچوں کی ماں بن کر اپنی جوانی کی بھول کو وہ جلد ہی بھول گئی ہو گی''

''تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟ تُم ملیں اُسے۔۔''

ہر لمحہ میرے تجسس کو ہوا دے رہا تھا

''ہاں ملی اور اُسے بتایا بھی۔۔''

''پھر۔۔۔؟'' میرا سانس رُک سا گیا

''ہاہاہا ۔۔اُس نے ایک بڑی رقم کا چیک مجھے تھما دیا ۔۔۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا ۔۔۔منافق!''

''اوہ''

''مگر میں نے انتقام لے لیا اُس سے''

''کیسے۔۔؟''

میں نے چیک پھاڑ کر اس کے منہ پر دے مارا اُسی لمحے اس کی آنکھوں میں جو پہچان جاگی ۔۔۔مجھے سینے سے لگانے کی جو حسرت اور تڑپ چہرے پر اُبھری ۔۔ وہی میرا انتقام تھی''

''تیزی سے اسکے چہرے پر مامتا اور پچھتاوے کے سائے لہرائے ۔۔۔ کار چلی گئی ۔۔ مگر وہ مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھتی رہی ۔۔۔دور تک ۔۔اب جلنے کی رونے کی باری اُس کی ہے ۔۔ ہر لمحہ اسکی کوکھ تڑپے گی ۔۔ سینے میں آگ بھڑکے گی ۔۔ریشمی بستر پر وہ سو نہ سکے گی ۔۔دولت کے انبار تلے وہ سانس نہ لے سکے گی ۔۔اور ایک دن میرا نام پکارنے کی کوشش میں ۔۔وہ پاگل ہو جائے گی ۔۔ اور اور مجھے سکون ملے گا''

یہ کہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، مجھے لگا اس کی آنکھوں میں پچھلے لمحوں کی دُھول چَھٹ رہی ہے ۔۔ گاڑی کب کی جا چکی تھی وہ تنہا سڑک پر کھڑی راستہ کھوج رہی تھی ۔۔یا وہیں کہیں منجمد ہو چکی تھی۔

☆☆☆

زہریلا بیج

اس کے چہرے پر صحرا کی ریت اڑ رہی تھی۔ بازوؤں میں بگولے چھپے تھے اور بالوں میں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ جانے کون سی مسافتوں کا ہم رکاب تھا کہ بے چینی اس کے انگ انگ میں ڈولتی پھرتی تھی۔ اس کا قبیلہ صدیوں پہلے معتوب ہو کر در بدر پھرتا تھا۔ کوئی بددعا ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ سنا ہے محبت کرنے والی عورت کی بددعا کسی بدروح کی طرح نسلوں کا پیچھا کرتی ہے۔ گھاس اس کے بدن تلے مسلی جا رہی تھی۔ اس کے پاؤں نرم و نازک پتیوں کو کچلے جا رہے تھے۔

''کیوں محبت کرنے والی عورت کی بددعا میں ایسی کیا تاثیر ہوتی ہے؟''

میں نے اس کی بے قرار آنکھوں میں جھانکا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ صحرا کے ٹیلے اس کی آنکھوں میں سرکنے لگے۔ یہ صحرا بھی عجب ہے۔ بیک وقت ظالم اور مہربان۔ دن بھر قہر برساتا ہے اور رات ہوتے ہی اپنے سحر کا اسیر کر لیتا ہے۔ ہر ذی روح کو تمام حسیات سمیت جکڑ لیتا ہے۔

''بددعا تو بددعا ہوتی ہے...... مگر محبت کرنے والی عورت کی بددعا عذاب کیوں بن جاتی ہے''۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس کے بازو میں بندھے بگولے بے چین ہو گئے، آواز پھڑ پھڑائی۔ شاید اس

لیے کہ محبت کرنے والی عورت خدا سے بھی زیادہ دیالو ہوتی ہے۔ خدا تو اپنے چاہنے والوں کو ہزار ہا آزمائشوں سے گزارنے کے بعد ایک جھلک دکھاتا ہے۔ اور وہ جو محبت کا بیج دل میں اگاتی ہے سارے پھل، پھول پتے حتیٰ کہ اپنی جڑیں بھی چاہنے والے کے بدن پر اگانے لگتی ہے۔ انہی جڑوں سے نئے پودے اگتے ہیں جن کے پھل پھول کسی اور جھولی کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور پھر!! خاموشی بین کرنے لگتی ہے...... ہو کے بھرتی ہے۔ میں گھبرا کر پوچھتی ہوں

''پھر؟''

پھر پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔ جڑیں زہریلی ہونے لگتی ہیں...... پھل، پھول، پتوں شاخوں سب میں زہر بھرنے لگتا ہے۔ وہ بازوؤں میں بھرے بگولوں کو روکتے ہوئے کہتا ہے۔

''بس کوئی ایک بیج زہریلا ہو جائے تو صدیوں کے بدن میں زہر بھر جاتا ہے''۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' میں نے اس کے بالوں میں ٹمٹماتے تاروں سے پوچھا جو آسمانی رازوں سے واقف تھے۔

''عورت ایسی محبت کیوں کرتی ہے؟ کیوں ٹوٹ کر چاہتی ہے کہ خود کو سمیٹ نہیں سکتی؟''

میں نے اپنے اندر بھی کچھ ٹوٹتے محسوس کیا مگر آواز باہر نہ آ سکی۔

''تم سوال بہت کرتی ہو'' اس کی آواز صحرا کی ہوا سے مشابہ تھی۔

''اس لیے کہ تمہارا قبیلہ صدیوں سے در بدر ہے تمہارے پاس جوابوں کا بڑا ذخیرہ ہے''۔ میں کھوجی بن چکی تھی۔

''شاید ہر رنگ کی مٹی، ہر پانی کے ذائقے ہر جنگل کی خاموشی ہر صحرا کی اداسی کے

اپنے راز و نیاز ہوتے ہیں۔ جنہیں کھوجتے کھوجتے کچھ سوالوں کے جواب مرے ہاتھ آ گئے۔ اس نے اچانک میری بجھی ہوئی راکھ کو کریدا......

''تم نے کبھی محبت ہے؟''

اس کی آواز گونج بن کر میری روح کے پاتال میں چکر کاٹنے لگی۔ صدیوں سے دربدر قبیلے کے بیٹے نے میرے چہرے پر اپنے سوال کا جواب پڑھ لیا۔

''میں جانتا تھا......لیکن تم نے بددعا کیوں نہیں دی؟''

اس نے پہلی بار مسکرا کر مجھے دیکھا۔ ٹھنڈے میٹھے آبشار میں نے پہلی بار یکجا دیکھے۔

''تم ایک معجزہ ہو'' میں اتنا ہی کہہ سکی۔

''اور معجزے روز روز جنم نہیں لیا کرتے''۔ اس نے فقرہ اچھالا جسے ہوا نے جلدی سے اچک لیا۔

''ہاں تو تم بتا رہے تھے اس عورت کے بارے میں جس نے تمہارے قبیلے کو بددعا دی تھی''۔ میں نے بات کا رخ بدلا۔ ورنہ ہوا مرے راز بھی لے اڑتی۔

''اس کا محبوب تمہارے قبیلے کا سردار تھا یا عام آدمی۔ کیا وہ عورت بھی تمہارے قبیلے سے تھی؟'' میری بے تابی صحرا کے ٹیلے دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے پہلو بدلا، ٹمٹماتے ستارے زمین پر جھانکنے لگے، بگولے ساکت ہو گئے اور صحرا خاموش۔ محبت کی مقدس کہانی کے گواہ ایک بار پھر ہمہ تن گوش تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے بدن میں انگڑائیاں بھونچال بننے لگی تھیں۔ یوں جیسے محبت کا زہر اس کی رگوں میں بھی اتر رہا ہو، نشہ بن کر۔ وہ اب بے قراری سے صحرا اور آبشار کے درمیان ہوا پر قدم جما رہا تھا۔ وہ دردِ زہ میں مبتلا تھا شاید۔ جس درد سے میں

بھی واقف تھی۔ میں نے اس کے درد کو اپنے اندر اترتے محسوس کیا۔ اس کی سرگوشی چاروں جانب چکر کاٹنے لگی۔

''وہ دوسرے قبیلے سے تھی۔ ہرے بھرے میدانوں میں ہوائیوں کے سنگ اڑتی پھرتی تھی۔ اس کے حسن اور معصومیت پر دیوتا بھی قربان تھے۔ اپنے آپ میں مگن دھرتی کی مغرور بیٹی کو جانے کیا ہوا کہ ایک دن'' وہ رک گیا۔ میں سرتاپا سوال بن گئی۔

''پھر اس کے غرور اس کی مستی کو ختم کرنے محبت کا بیج اس کے دل پر آن گرا۔ ہمارے قبیلے کا جنگجو جو محبت تو کیا رحم کے لفظ سے بھی ناآشنا تھا اس کو بھا گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، محبت محبت سے عاری لوگوں کی جھولی میں کیوں گرتی ہے؟''۔

میں اداس ہو گئی۔

''شاید اس لیے کہ جو جس چیز سے محروم ہوتا ہے اسے وہی چیز ملتی ہے''

وہ بھی بے چین سا تھا۔

''میں بھی اسی سوال کا جواب کھوج رہا ہوں''۔

''اچھا تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر دھرتی کی مغرور بیٹی ایک التجا بن کر رہ گئی۔ جنگجو کی ایک نظر ایک لمس کو ترسنے لگی۔ مگر جنگجو تو جسموں اور جہانوں کا فاتح تھا، دلوں کا نہیں...... دھرتی کی بیٹی ٹوٹ گئی۔ اس کے اشک سیلاب بن گئے اور آہیں طوفان۔ ہرے بھرے جنگلوں میں دھول اڑنے لگی۔ ندیاں، آبشار، دریا سب سوکھ گئے۔ آنکھوں، دلوں اور دھرتی پر راکھ پھیل گئی''۔

''اور وہ جنگجو؟''

میں اس کے بدترین انجام کا سوچ کر پوچھا۔

''وہ جنگجو؟''

''ہوا میں پھنکار بھر گئی۔ وہ سالہا سال جیا۔ اس کی نسلوں نے صدیوں پر حکومت کی لوگ بھوک پیاس سے مرنے لگے۔خوراک پانی کی تلاش میں بکھر گئے۔ بٹ گئے۔تتر بتر ہو گئے۔اور جنگجو کی اولاد پھلتی پھولتی رہی''۔

''اور دھرتی کی مغرور بیٹی؟ کیا اس نے دکھ سے خودکشی کر لی؟'' میرا دل پھٹ رہا تھا۔

''خودکشی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔کئی نام، ہاں اس نے خودکشی ہی تو کی تھی''۔

اس نے روکا ہوا سانس باہر پھینکا۔

''اس نے جنگجو کو اپنا جسم فتح کرنے دیا اسے فاتح بنا دیا یہی اس کی محبت کی معراج تھی''۔

''اوہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی؟'' مرے آنسو صحرا پر بہہ نکلے۔

''ہاں جانتے بوجھتے ہوئے، انجانے میں تو دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ تو محبت تھی محبت میں خود کو ہارنا تھا اس نے۔ میں نے کہا تھا نا محبت کرنے والی عورت خدا سے بھی زیادہ دیالو ہوتی ہے جنگجو اسے تاراج کرتا رہا وہ لہولہان ہوتی رہی ایک دن اس کا دل راکھ ہو گیا''۔

''اور وہ راکھ اس کے قبیلے والے لے گئے؟''

''ہاں کیوں کہ وہ راکھ ہمارے قبیلے والوں کو اندھا کرنے لگی تھی حتیٰ کہ بچے بھی اندھے پیدا ہونے لگے تھے۔ ماؤں کی چھاتیاں سوکھنے لگی تھیں کنواریوں کے خواب مرنے لگے تھے۔اور وہ جنگجو راج وتاراج میں مصروف رہا''۔

''سزا محبت کرنے والی کو نہیں محبت کو مارنے والے کو ملنے چاہیے تھی''۔

میں نے احتجاجی چیخ ماری، آنسو اندر باہر مجھے جل تھل کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ آنسوؤں کی اس جھیل میں تیرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے کنارے پر ہی روکنا چاہا۔اس نے بازیوں کے بگولے ہوا میں چھوڑے اور سسکاری بھری۔

''محبت ایک عطا ہے جبکہ راج وتاراج کی خواہش ایک سزا''۔

مرے اندر ایک پرندہ بولا:

''یہ سچ ہے۔یہی سچ ہے ازلی سچ مگر ہمارے قبیلوں کا سچ کچھ اور ہے''

وہ مرے آنسوؤں کی جھیلوں میں اتر چکا تھا۔ میں اسے روکنا چاہتی تھی مگر جانتی تھی وہ نہیں مانے گا۔ میں دھرتی کی مغرور بیٹی کے قبیلے سے تھی اور وہ جنگجو کے قبیلے سے۔اس بار محبت اسے عطا ہوئی تھی۔مگر راج وتاراج مرے بس میں نہ تھا۔اور مرے دل میں محبت کا بیج بہت پہلے زہریلا ہو چکا تھا۔

☆☆☆